اجنبی ساعتوں کے درمیان
نعمان شوق

اجنبی ساعتوں کے درمیان

مجموعۂ کلام

نعمان شوق

اس کتاب کی اشاعت میں بہار اردو اکادمی
کا مالی تعاون شامل ہے۔

اجنبی ساعتوں کے درمیان

(مجموعۂ کلام)

نعمان شوق

زیرِ اہتمام:

تخلیق کار پبلشرز

۱۷۷۹ - کوچہ دکھنی رائے، دریا گنج، نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۰۲

○

نام کتاب : اجنبی ساعتوں کے درمیان
ناشر و مصنف : نعمان شوق
پتہ : A-501, Prasar Kunj, Sector Pie One
Greater Noida 201306 (U.P)
Mobile 09810571659
nomaanshauque@gmail.com
تعداد :

زیرِ اہتمام : انیس امروہوی
○ تخلیق کار پبلشرز، ۱۷۷۹، کوچہ دکھنی رائے، دریا گنج، نئی دہلی، ۱۱۰۰۰۲
سرورق : نسیم آرٹسٹ
کتابت : عبدالرحمٰن
مطبع : بلس آفسیٹ پرنٹنگ ورکس، ۲۵۰۹، کوچہ بقا، اللہ ترابا بہرام خاں، دریا گنج، نئی دہلی، ۲

: ملنے کے پتے :

○ اہلو والیہ بک ڈپو، ۹۹۸۸/۴۹، تیور وہتک روڈ، نئی دہلی، ۱۱۰۰۰۵
○ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، گلی وکیل، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی، ۱۱۰۰۰۶
○ موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹، گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی، ۱۱۰۰۰۲
○ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی، ۱۱۰۰۰۶
○ بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ

T.P. : 058

"AJNABI SA'ATON KE DARMIYAN" (Poetry) 1997
By: NOMAN 'SHAUQUE' Rs. 60/-
TAKHLEEQKAR PUBLISHERS
1779, Kucha Dakhni Rai, Darya Ganj, New Delhi-110002

انتساب

جناب تاج پیامی

کے نام
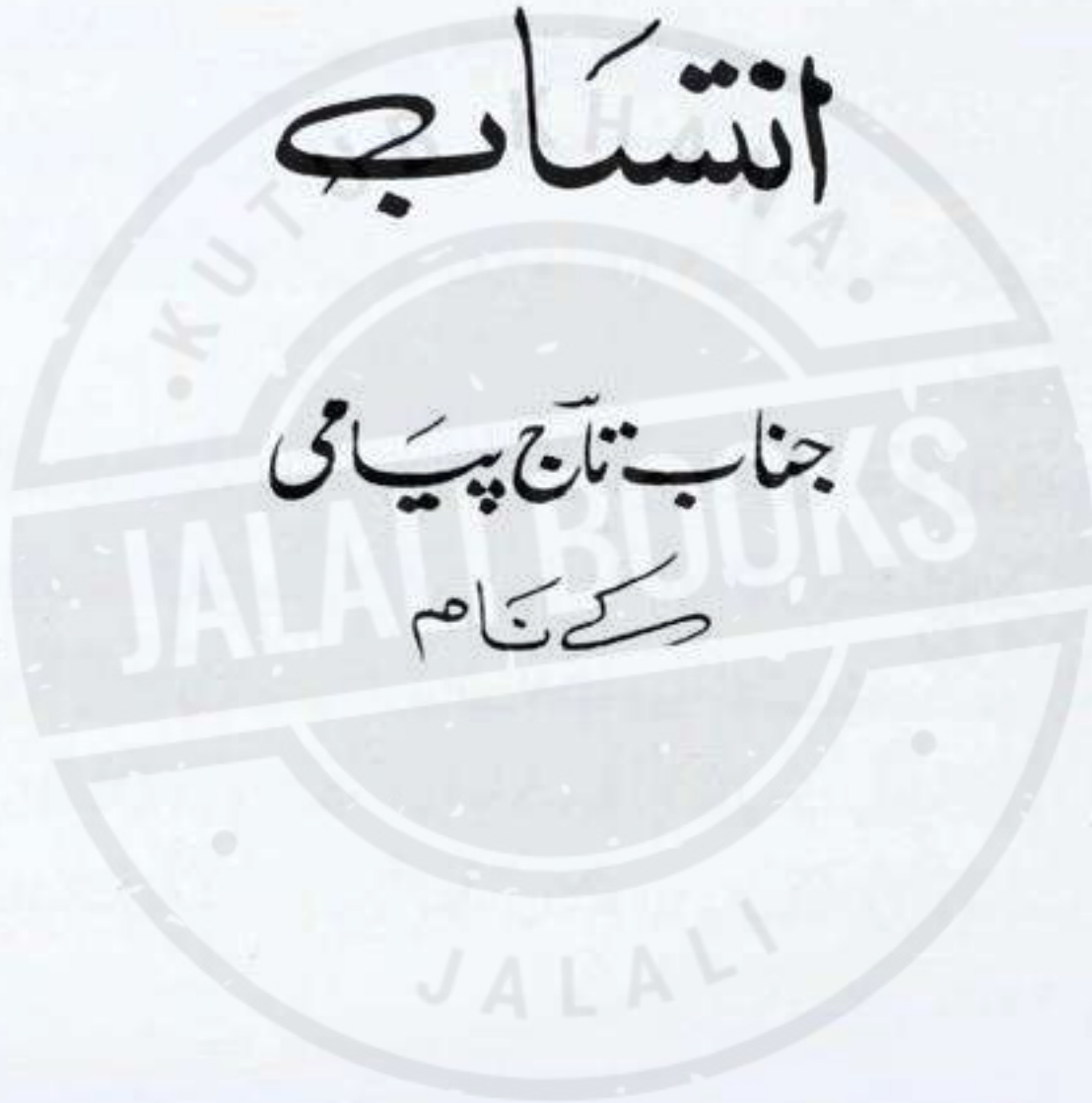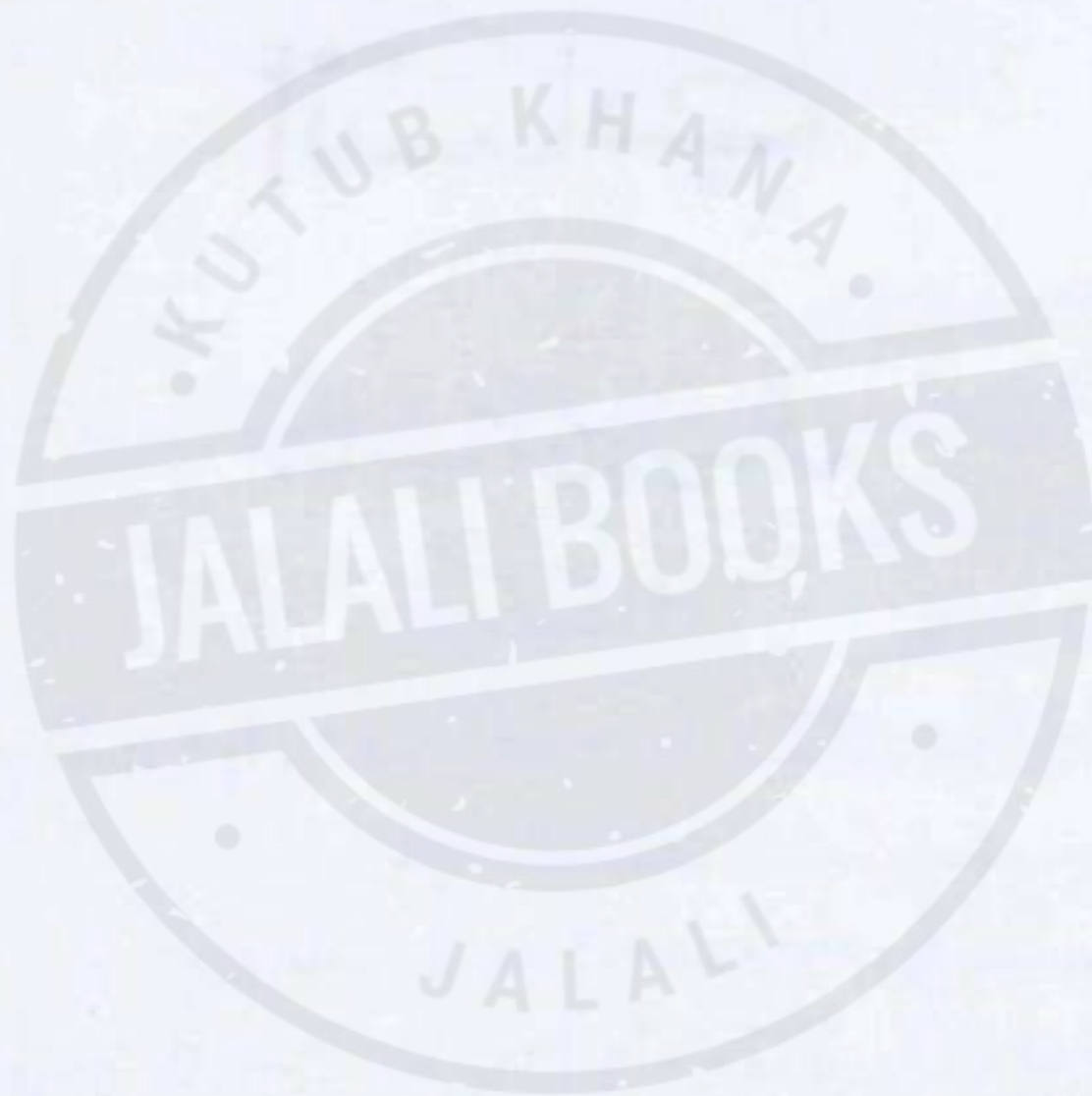
نام : سید محمد نعمان

قلمی نام : نعمان شوق

تاریخِ پیدائش : ۲ر جولائی ۱۹۶۵ء

ملازمت : اردو مجلس، آل انڈیا ریڈیو، نئی دہلی، ۱۱۰۰۰۱

آبائی وطن : ملکی محلہ، آرہ (بہار)

پتہ :

A-501, Prasar Kunj, Sector Pie One
Greater Noida 201306 (U.P)
Mobile 09810571659
nomaanshauque@gmail.com

پیش لفظ

انسانی ارتقا کی تاریخ کے اس موڑ پر جہاں بیسویں صدی اپنا سفر ختم کر رہی ہے، کلون، روبوٹ، انٹرنیٹ اور ایسے ہی نہ جانے کتنے موضوعات ہماری روز کی گفتگو کا ایک حصہ بن چکے ہیں۔ وہ حسّی اور جذباتی نشیب و فراز سے پُر زندگی جو ہمارے پیش روؤں کو ورثے میں ملی تھی، ہمارے لئے شاید قصّۂ پارینہ بن چکی ہے۔

ہر چند کہ آج ساری کائنات سمٹ کر ایک چھوٹی سی گیند کی طرح ہمارے ہاتھوں میں آچکی ہے، افکار و نظریات کے معاملے میں فاصلاتی عوامل کو نظر انداز کرتے ہوئے بیرونی دُنیا پر بہت زیادہ انحصار خاصہ مضر ہے۔ اُردو ادب کا المیہ یہ ہے کہ یہاں باہر سے لائی ہوئی تحریکات و نظریات کو تھوپنے کی کوشش بہت سنجیدگی کے ساتھ کی گئی، خواہ وہ جدّت پسند حضرات ہوں یا ترقی پسند۔ دونوں نے ادب کے ساتھ وہی سلوک کیا جو اندھوں نے ہاتھی کے ساتھ کیا تھا۔ ادب کو اس کی Totality میں دیکھنے سے دانستہ گریز کیا گیا۔

ایک سچّے فنکار کو اپنے ذہن کے تمام دروازے کھُلے رکھنے چاہئیں تاکہ تازہ افکار و نظریات سے نابلد نہ رہے لیکن اپنے قلم کو کسی خاص نظریے کا تابع نہیں بنانا چاہیئے کیونکہ کوئی بھی نظریہ کتنا بھی عظیم کیوں نہ ہو ایک خاص وقت کے بعد متروک و مردود قرار دے دیا جاتا ہے تغیر و تبدّل فطرت کا نظام ہے اسی لئے کسی مخصوص نظریے کی تبلیغ کے مقصد سے لکھا گیا ادب بھی جلد ہی اپنی چمک دمک کھو بیٹھتا ہے اور اپنی موت آپ مر جاتا ہے۔

میری شاعری میرے حسّی تجربات کی زائیدہ ہے جس کی نیرنگی اور بوقلمونی نے میرے اندر ایک پورا جہان آباد کر رکھا ہے لیکن میری شاعری کی رُوح اُداسی کی خوشبو میں بسی ہوئی ہے۔

کائنات کے اس وسیع و عریض طلسم کدے میں کئی حیرت فزا مقامات سے میرا گزر ہوا ہے اور میری شاعری میں میری حیرانیوں کا اندراج جا بجا مختلف انداز میں موجود ہے۔ میری زندگی ان معنوں میں کافی پیچیدہ رہی کہ اس میں مختلف کیفیات و محسوسات متصادم ہوتی رہیں۔ میں ایک ہی پل میں سرشاری سے بے زاری تک کا سفر یوں طے کر لیتا ہوں کہ بعض اوقات خود بھی سمجھ نہیں پاتا کہ زندگی میں اتنا سب کچھ اتنی تیزی سے کیسے بدل جاتا ہے۔

شاعری انسان کے باطن سے پھوٹنے والی روشنی کا نام ہے۔ کسی بھی واردات کا محض سرسری مشاہدہ کر کے اسے شعر کے قالب میں ڈھالنے کا عمل شاعری کے ساتھ ایک بھونڈا مذاق ہے۔ میں نے اپنے آس پاس پھیلی ہوئی دنیا کا صوفیانہ استغراق کے ساتھ مطالعہ کیا ہے۔ زندگی کی ظاہری حقیقت میرے لئے کوئی خاص معنی نہیں رکھتی کیونکہ شاعر کی نظر انفس و آفاق کی باطنی پہنائیوں میں اتر کر ان اسرار و رموز سے پردے ہٹاتی ہے جن کی آگہی کے لئے بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے بصارت کی نہیں۔

میں اپنے پیش رو شعراء کی طرح اپنی ذات کے حصار میں مقید ہونا پسند نہیں کرتا۔ ہاں! اتنا ضرور ہے کہ میں کائنات کو اپنی ذات کے حوالے سے جاننے کا قائل ہوں جس طرح روشنی پرزم (PRISM) سے گزر کر اپنے تمام رنگوں کو عیاں کرتی ہے اسی طرح کائنات کا سچا ادراک ذات کے حوالے سے ہی ممکن ہے اور یوں میری شاعری اس کائنات کو سمجھنے کی ایک ادنیٰ سی کوشش ہے۔

(دستخط)

(نعمان شوق)

سوتے جاگتے ان آنکھوں نے تیرا نام لیا
شام و سحر ہر دم چڑیوں نے تیرا نام لیا

پھول کھلے ویرانے میں جب تیری یاد آئی
خوشبو پھیلی جب ہونٹوں نے تیرا نام لیا

موجِ طرب میں تیرا شکر ادا کر لیتے ہیں
آنکھیں چھلکیں تو اشکوں نے تیرا نام لیا

میں نے باغ سے پوچھا کس کی خاطر سجتے ہو
لب کھولے جب تو غنچوں نے تیرا نام لیا

دریا ٹھہرا جب دریا کو تیرا حکم ملا
پانی برسا جب کھیتوں نے تیرا نام لیا

چندا نکلا تو تاروں سے تیری باتیں کیں
سورج ڈوبا تو لوگوں نے تیرا نام لیا

کوئی رُت ہو تیرے حکم سے آتی جاتی ہے
تیز ہوا میں بھی پتوں نے تیرا نام لیا

○
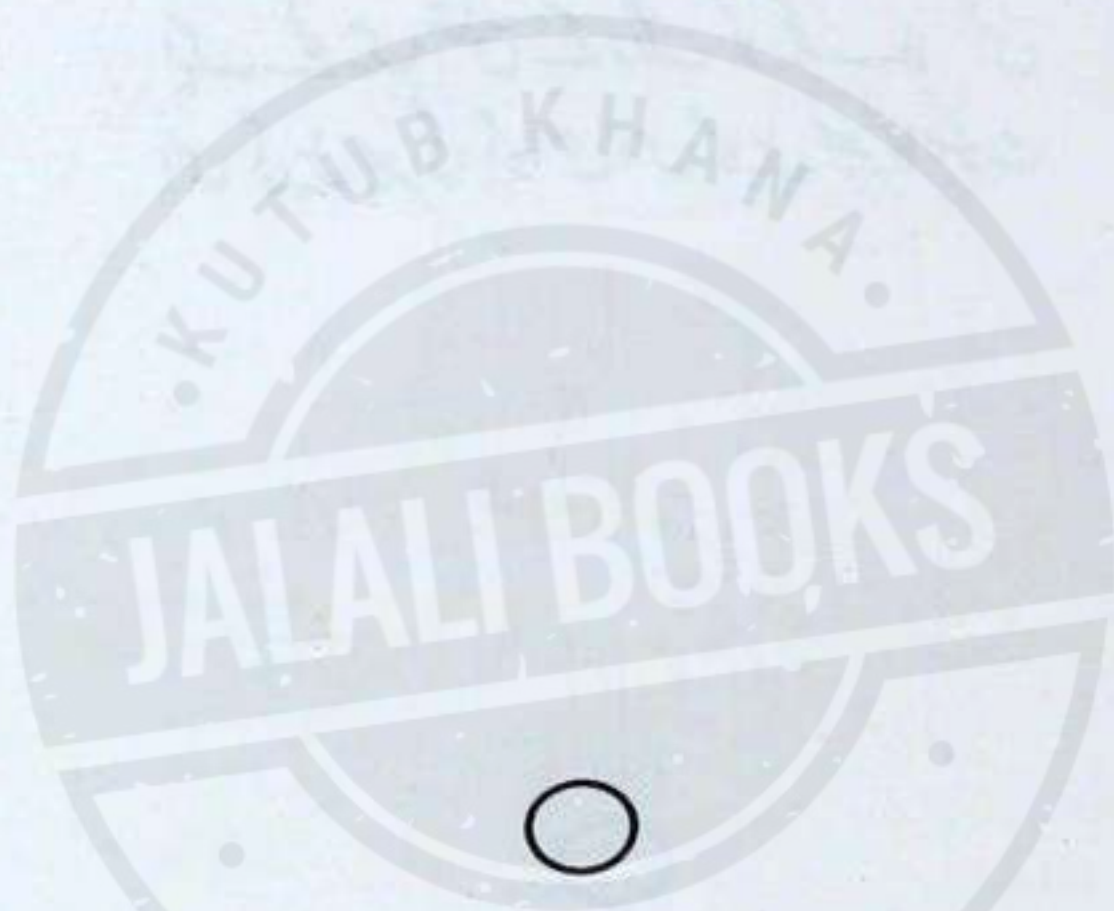
ایک پل میں ٹوٹنے کو ہے سمندر کا سکوت
یہ اشارہ کر رہا ہے ریت کے گھر کا سکوت

ہم بہت پچھتائے آوازوں سے رشتہ جوڑ کر
شور اک لمحے کا تھا اور زندگی بھر کا سکوت

ہو سکے تو کیجیے اب زلزلے کا اہتمام
ورنہ دستک سے نہیں ٹوٹے گا اس گھر کا سکوت

ایک شام ایسی بھی آئے ہم انہی کے ہو رہیں
یہ اداسی کے جزیرے یہ سمندر کا سکوت

کوئی تو آواز اُبھرے دل کے ویرانے سے اب
چاٹتا جاتا ہے مجھ کو میرے اندر کا سکوت

ایک لمحے میں شفق کے رنگ کو کجلا گئی
اس کی پل بھر کی اُداسی، اس کا پل بھر کا سکوت

○
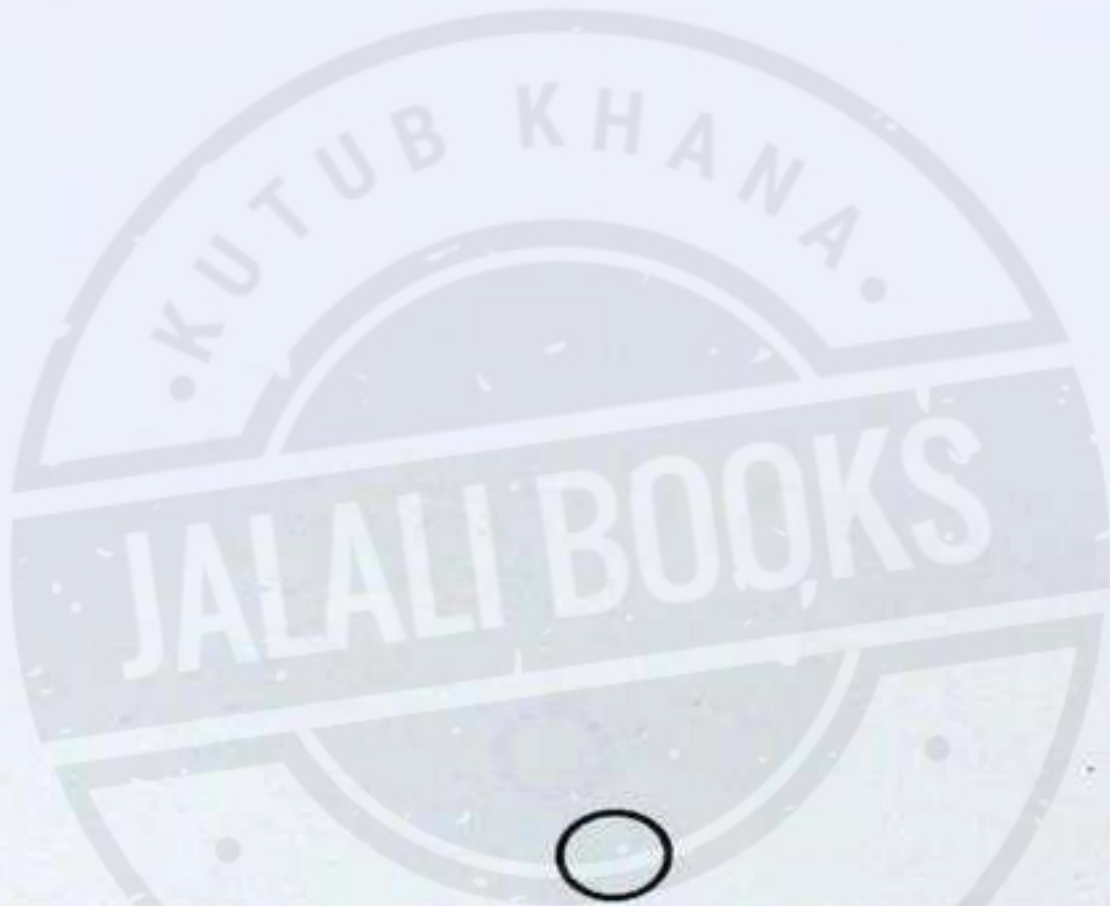
چمک جو اب کے بڑھی ہے سراب میں کچھ اور
اضافہ ہونا ہے شاید عذاب میں کچھ اور

مزاج خوشبو کا میری سمجھ سے باہر ہے
وہ ہر سنگار میں کچھ ہے گلاب میں کچھ اور

ہماری نسل محبّت کی بات کیا جانے
ہمیں پڑھایا گیا ہے نصاب میں کچھ اور

جو زرد پتے ملے ہیں وہی غنیمت ہیں
کہو ہوا سے کہ دیکھے نہ خواب میں کچھ اور

وہ میرے نام اِک اِک سانس کرنیوالا تھا
لکھا ہوا ہے مگر انتساب میں کچھ اور
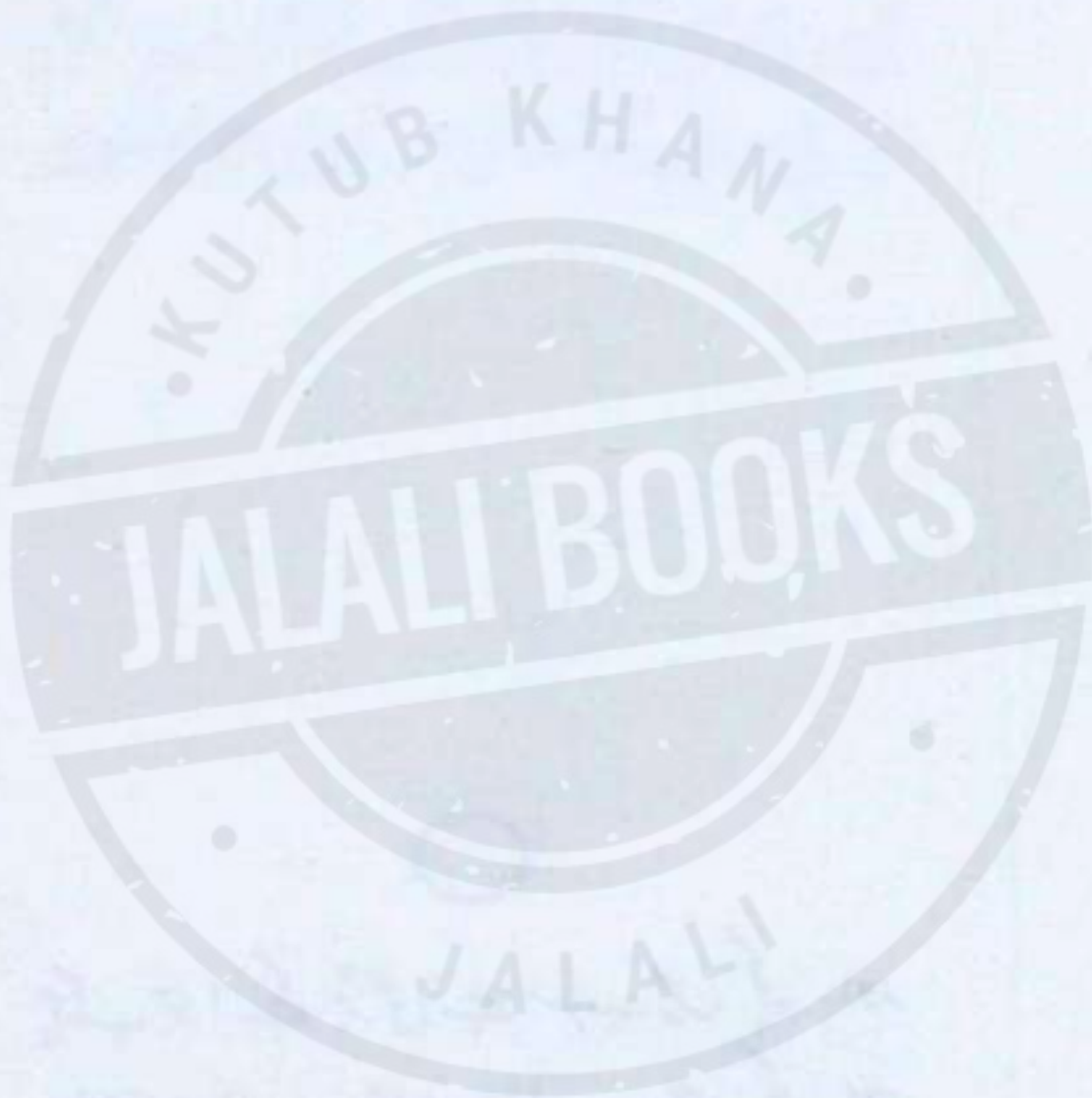
مُرجھا کے گر رہے ہیں افق سے دھنک کے پھول
تیرے بغیر رنگوں کی برسات بھی گئی

○
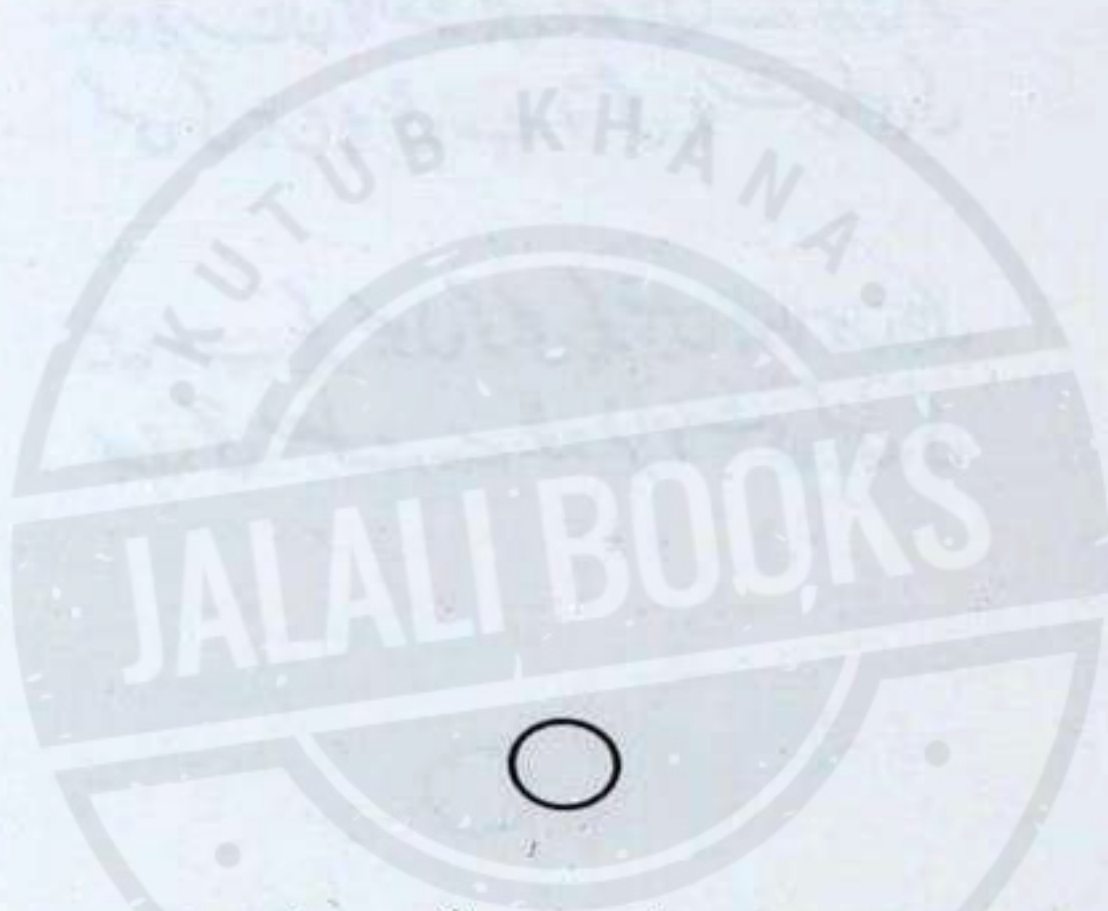
یہاں اب شور ہی کوئی نہ سرگوشی کسی کی
اگر کچھ ہے تو شاید ہو یہ خاموشی کسی کی

بلا ناغہ اسے خون آدمی کا چاہیے اب
ہمیں کھلنے لگی ہے یہ بلا نوشی کسی کی

اچانک چلتے چلتے اونگھنے لگتا ہے سورج
شفق زاروں پہ چھا جاتی ہے مدہوشی کسی کی

یہاں گرتے ہیں ہر دم ٹوٹ کر شاخوں سے پتّے
فضا میں گونجتی رہتی ہے سرگوشی کسی کی

گلی میں پھر وہی پرچھائیاں لہرا رہی ہیں
مری آہٹ سے کب ٹوٹی ہے مدہوشی کسی کی

وہ قبرستان کا نقشہ بھی رکھ دیں گے بدل کر
کسی کی تاج پوشی ہے تو گل پوشی کسی کی

میں سب کچھ بھول کر بھی کچھ نہیں بھولا ہوں اب تک
بھری تھی مصلحت سے خود فراموشی کسی کی

یاد کے نیلے سمندر میں سنہری کشتیاں
جیسے تاحدِّ نظر ہوں تتلیاں ہی تتلیاں

چاند کا چہرہ اتر جاتا ہے کھلتی رات میں
گونجتی رہتی ہیں بستی میں کسی کی سسکیاں

روشنی نے کب کیا افسردگی کا احترام
رقص کرتی ہیں مرے چاروں طرف پرچھائیاں

دل میں پھر بجنے لگی ہے خواہشوں کی جلترنگ
مجھ کو پھر آواز دیتی ہیں سنہری وادیاں

عمر بھر کی جانفشانی کا صلہ ربِّ کریم
راکھ ہوتی جا رہی ہیں لہلہاتی کھیتیاں

تیرا چہرہ صاف دِکھتا ہے اندھیری رات میں
مشعلوں کی طرح جلتی ہیں مری تنہائیاں

ان گلی کوچوں میں اب تو دھوپ بھی آتی نہیں
اپنے دل کا حال بتلائیں گی کس کو کھڑکیاں

اب تو میں ہوں اور یہ اندھی بھیانک رہ گزار
پانیوں میں بہہ گئی ہیں خواب کی بیساکھیاں

○

دھوپ آتی رہی اس کانچ کے گھر میں خود ہی
وہ گرفتار ہوا میرے اثر میں خود ہی

وہ تو بس ہاتھ ہلاتا ہے گزر جاتا ہے
شہر آجاتے ہیں وحشت کے اثر میں خود ہی

ہم تو اب بھی ہیں اسی تنہا روی کے قائل
دوست بن جاتے ہیں کچھ لوگ سفر میں خود ہی

کیوں چلے آئے ہو جلتا ہوا سامان لئے
ہم تو رہتے ہیں میاں موم کے گھر میں خود ہی

ہر تصوّر کو بدن دینے میں مصروف ہوں میں
خواب جاگے ہیں مرے دستِ ہُنر میں خود ہی

بنیں گے مالِ غنیمت میں حصّہ دار تو سب
لہولہان فقط میں ہی معرکے میں ہوں

○
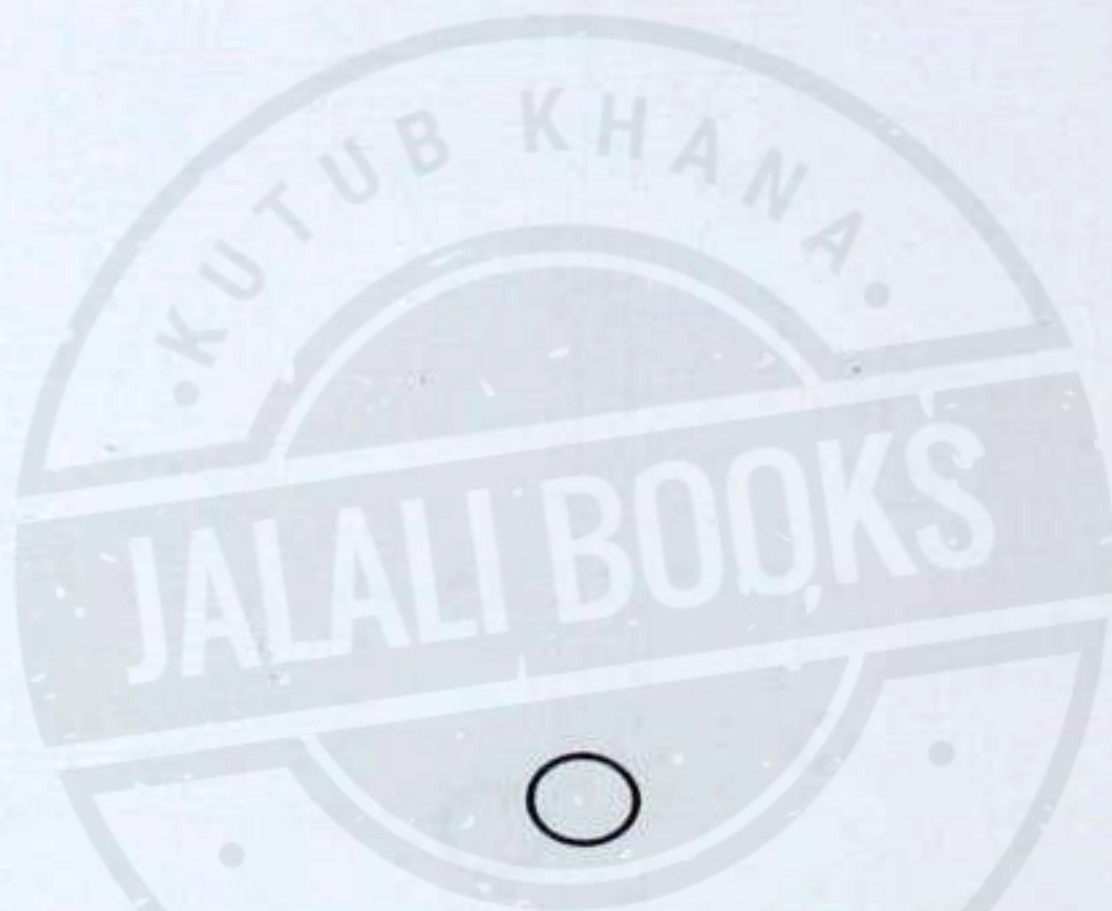
تمام دھوپ تو کہسار کھینچ لیتا ہے
نگاہ پھر بھی چمن زار کھینچ لیتا ہے

یہاں تو جان ہی جائے گی اس پرندے کی
حرام رزق سے منقار کھینچ لیتا ہے

میں اس سے ساری فصلیں گرا کے ملتا ہوں
وہ روز اِک نئی دیوار کھینچ لیتا ہے

ہم اُس سے عدل کی خیرات مانگتے ہیں جو
سروں سے سایۂ دیوار کھینچ لیتا ہے

میں اس سے صلح کا خواہاں ہوں اور عدو میرا
ذرا سی بات پہ تلوار کھینچ لیتا ہے
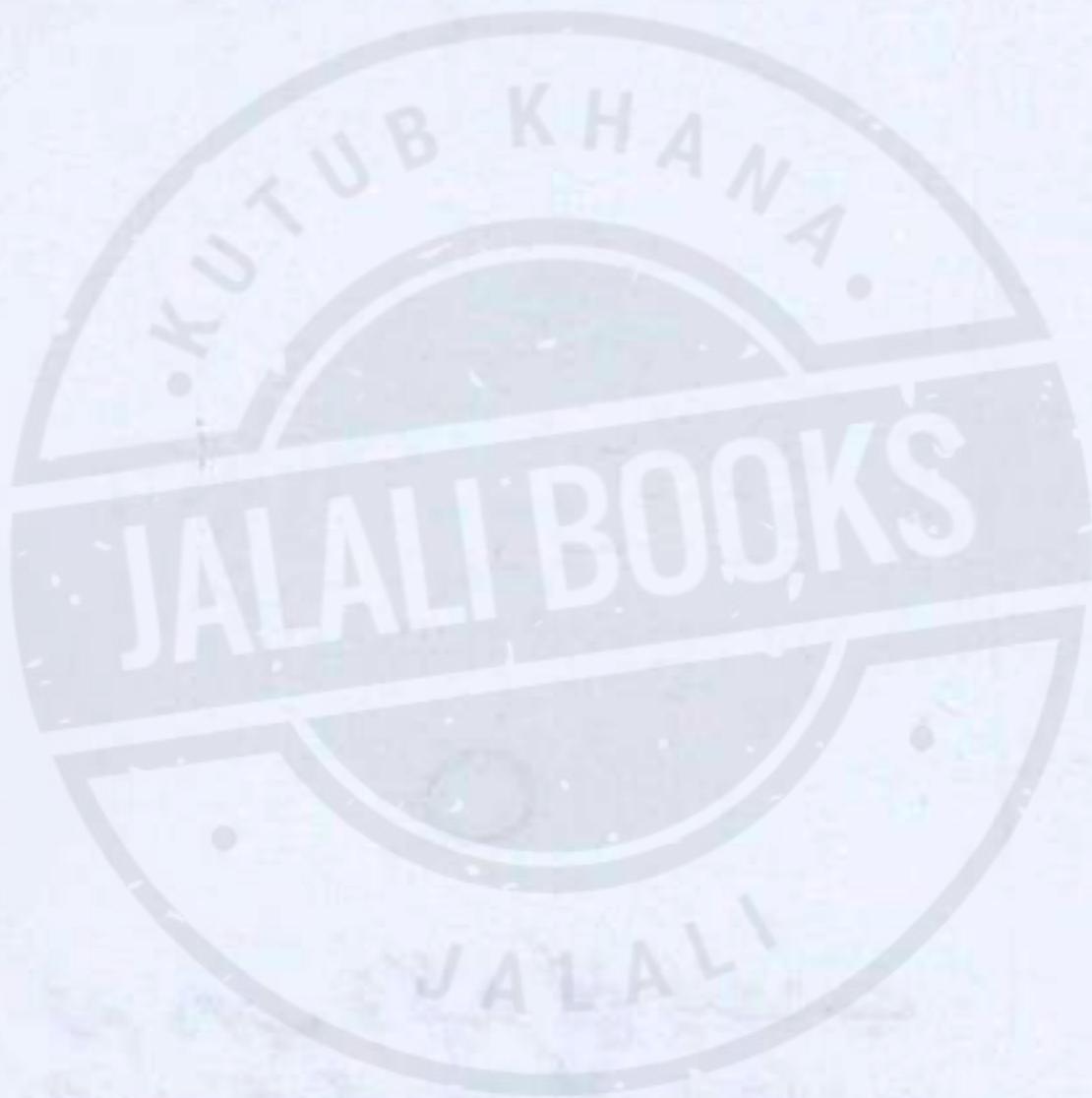
تجھ سے پہلے غم کی اس درجہ فراوانی نہ تھی
دل ملے تو درد کا آنگن کشادہ ہوگیا

○

قریب آ! کہ ارادے لہو کے دیکھتے ہیں
دہکتی آگ کو ہونٹوں سے چھو کے دیکھتے ہیں

اُدھر اُگاتی ہے فصلیں اِدھر ڈبوتی ہے
سلیقے ہم بھی تری آبجو کے دیکھتے ہیں

انہیں ہو پروا بھی کیوں پیار کرنے والوں کی
وہ حوصلے تو فقط جنگجو کے دیکھتے ہیں

اِک ایک کر کے گھروں کو جلائے جاتا ہے
کرشمے روز کسی صلح خو کے دیکھتے ہیں

ذرا سی دھوپ بدن کو گراں گزرتی ہے
یہ لوگ خواب مگر رنگ و بو کے دیکھتے ہیں

میں جانتا ہوں اذیّت پسند لوگوں کو
جو مسکرا کے مناظر لہو کے دیکھتے ہیں

○

نئے موسم کا تحفہ لا رہے ہیں
مگر وہ زرد پتّہ لا رہے ہیں

ہماری تیغ کو خلعت عطا ہو
نیاموں میں قصیدہ لا رہے ہیں

وہ پیغمبر تو کب کا جا چکا ہے
فرشتے اب صحیفہ لا رہے ہیں

ہمارے خون کی پیاسی ہیں لہریں
سمندر میں کنارہ لا رہے ہیں

انا بکنے پہ آمادہ نہیں تھی
مگر قاصد وظیفہ لا رہے ہیں
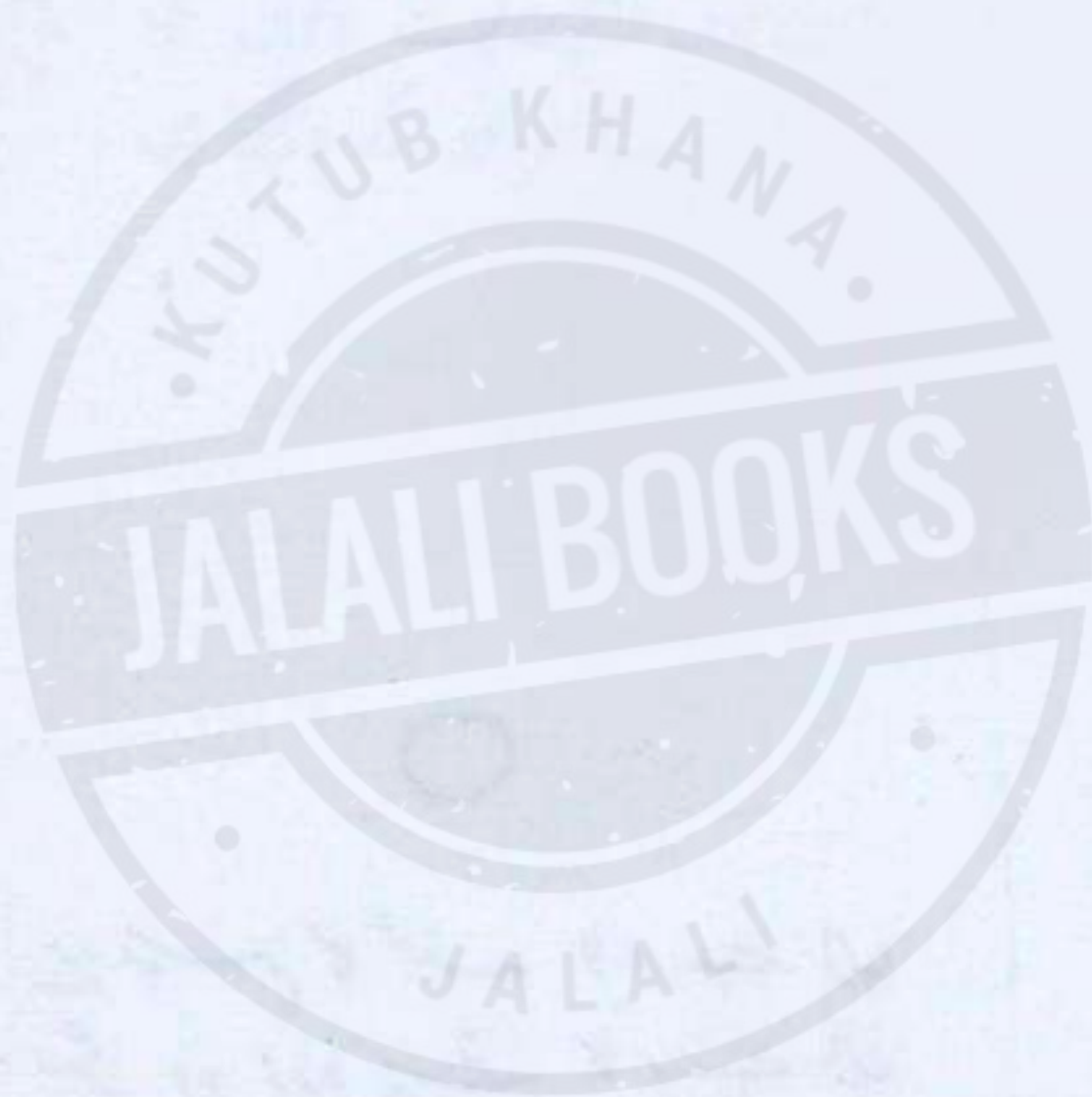
مجھ سے بہتر کون لکھے گا بھلا تفسیرِ غم
میں نے ہر آیت پڑھی ہے درد کے قرآن کی
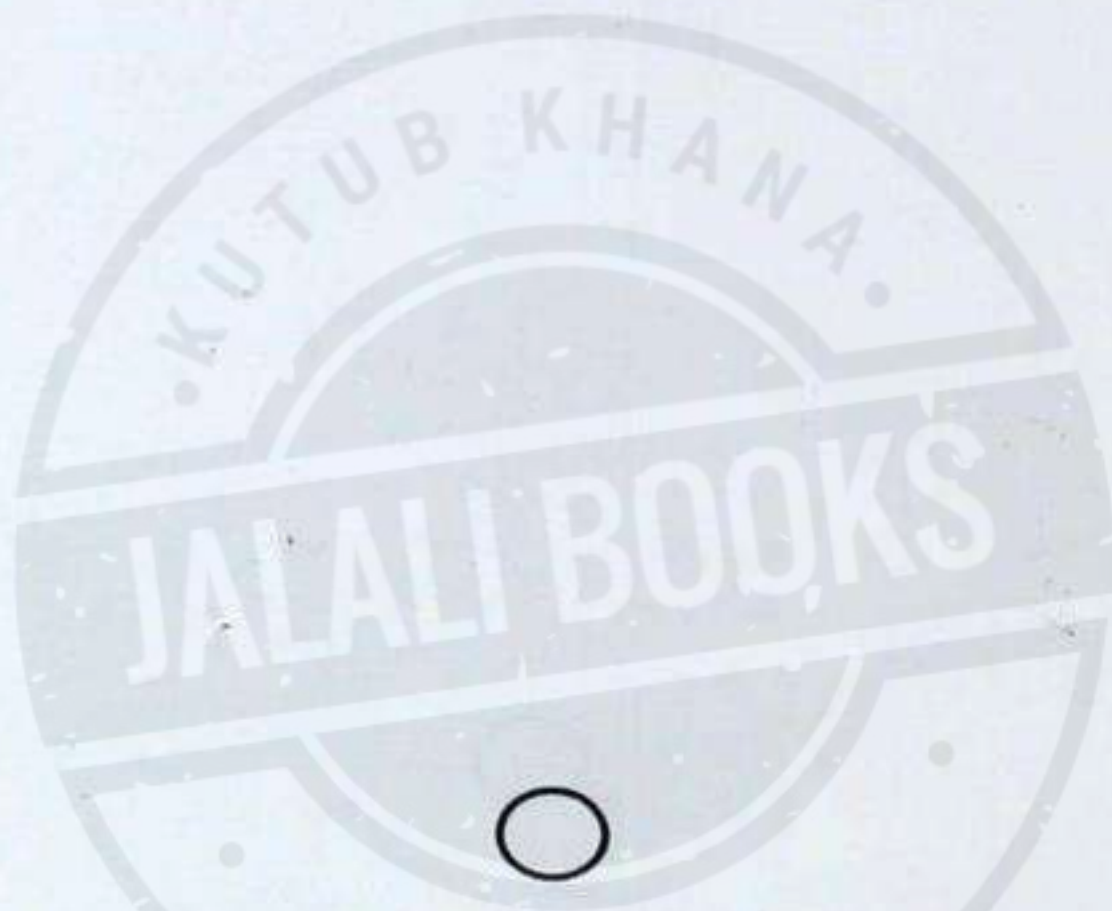
اُدھر جلال میں ڈوبی وہ باوقار آنکھیں
اِدھر ہیں سہمی ہوئی اور اشکبار آنکھیں

سفر سے لوٹے مگر ہم ابھی کہاں لوٹے
وہ نیم باز دریچے وہ بے قرار آنکھیں

جو تیرے جبر کو دیکھیں بھی راز بھی رکھیں
کہاں سے لاؤں میں اتنی گناہ گار آنکھیں

ہمیں گلہ ہے تو خود سے عتاب ہے خود پر
تری طرف نہ اٹھیں گی وظیفہ خوار آنکھیں

میں سچ کہوں تو زباں لڑکھڑانے لگتی ہے
ڈرا رہی ہیں مجھے اس کی شعلہ بار آنکھیں
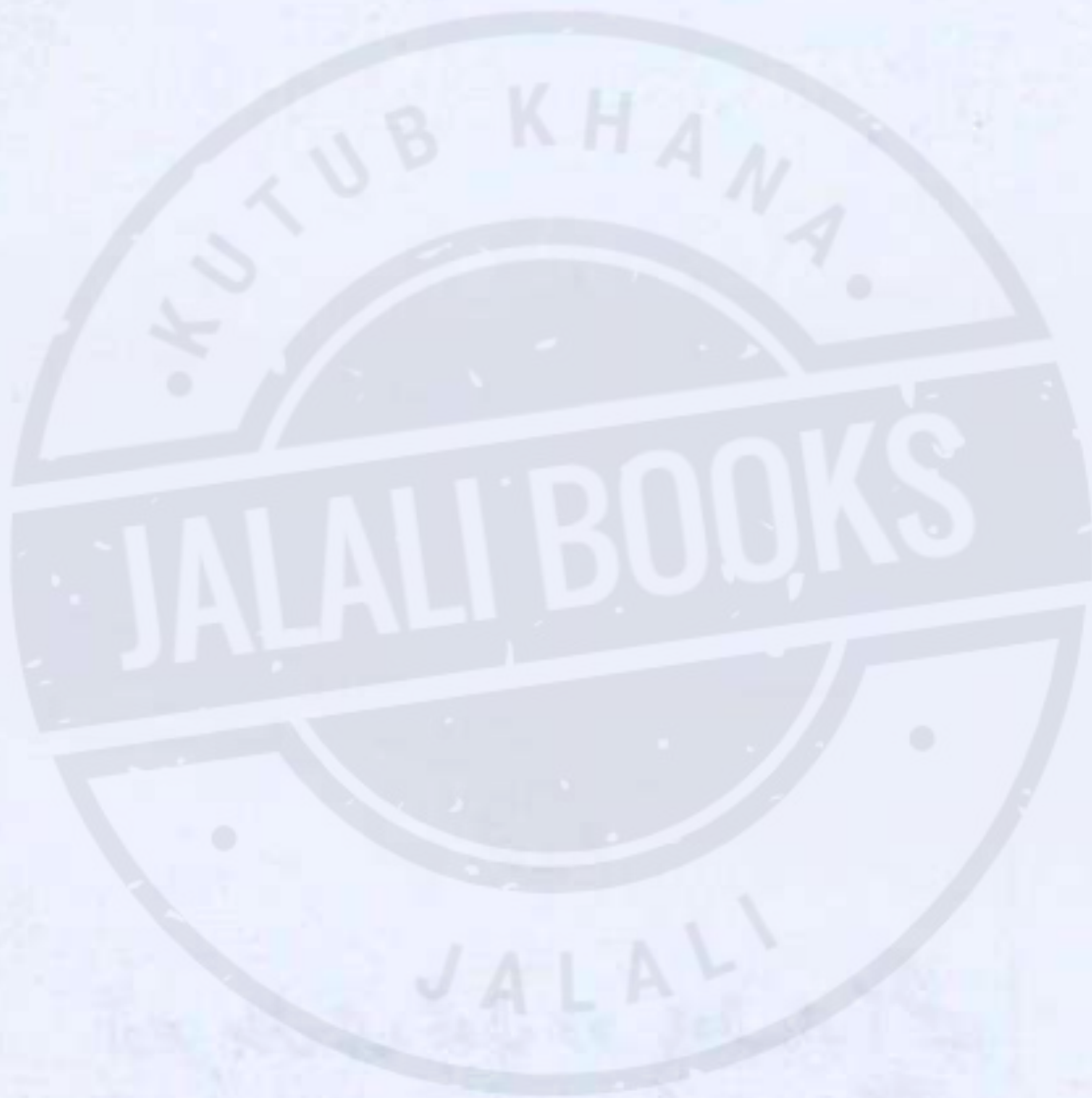
ہے اس غریب پہ تہمت دیا جلانے کی
جو ساری عمر ہواؤں کا ہم خیال رہا

○
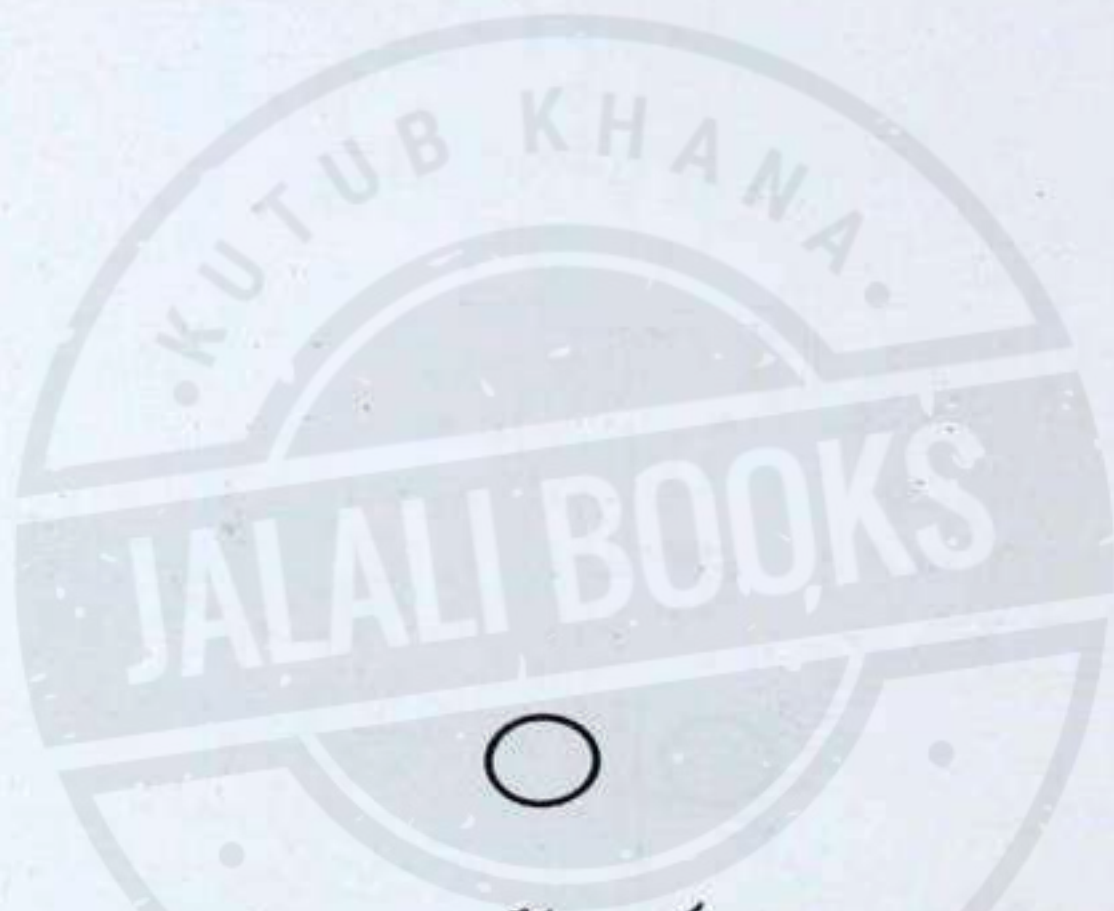
ہاں! دھوپ کی یلغار تھی سایہ نہ تھا مجھ میں
دیوار کے گرنے کا تو خطرہ نہ تھا مجھ میں

اے خواہشِ خوش رنگ کوئی اور مکاں ڈھونڈ
دم توڑ چکا جو ترا دیوانہ تھا مجھ میں

سب یاد ہیں تیری بھی جہانگیری کے قصے
دیوار تھی دیوار کا سایہ نہ تھا مجھ میں

اب بھیڑ ہے اتنی کہ کہیں چین نہیں ہے
پہلے تو کوئی شہر ہی بستا نہ تھا مجھ میں

وہ لوٹ کے جاتی ہوئی چڑیوں کی صدا تھی
اک شور مچاتا ہوا دریا نہ تھا مجھ میں
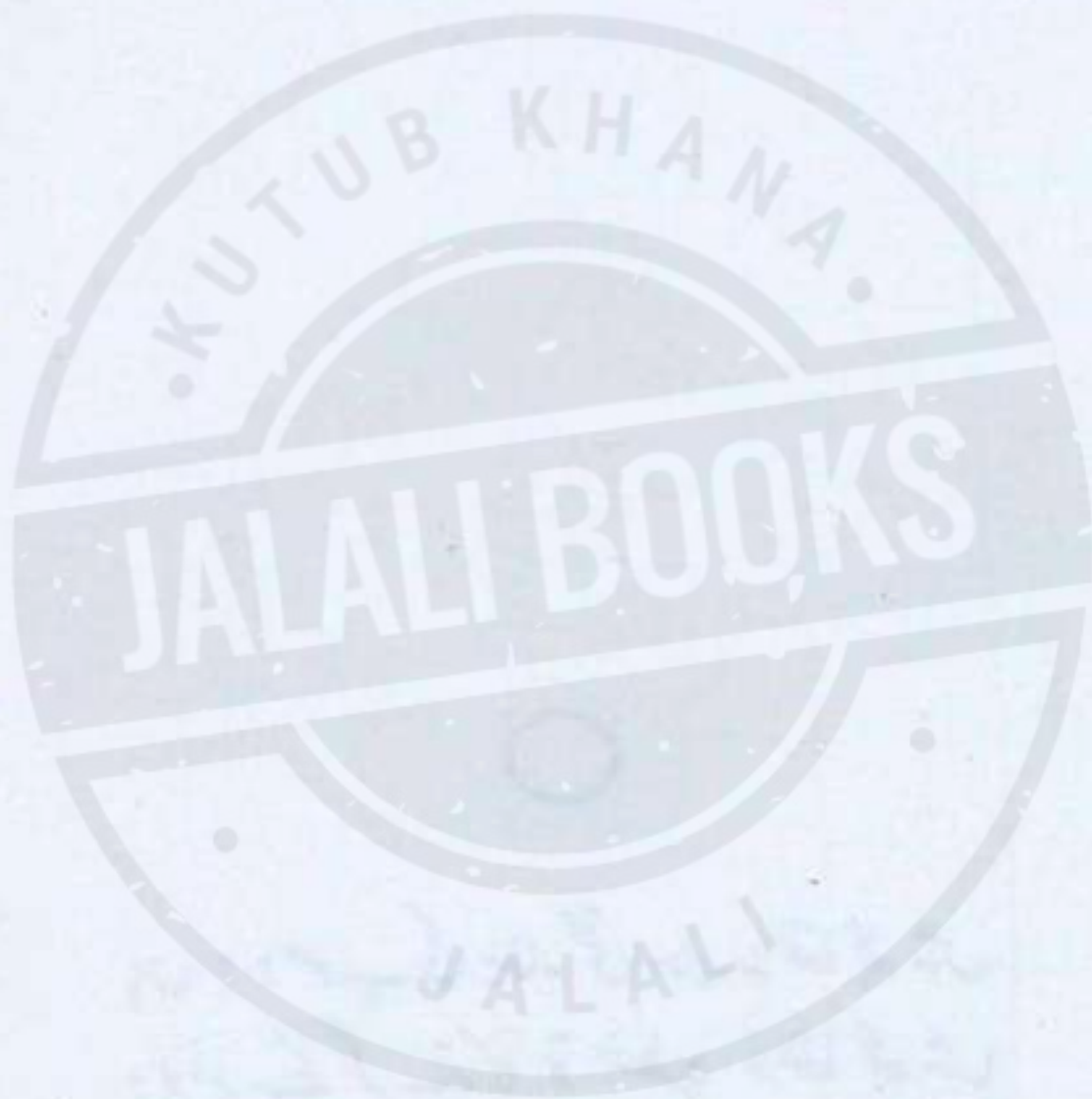
دنیا نہیں خدا کی مرصع غزل ہے یہ
اور میں وہ شعر ہوں جو کسی بحر میں نہیں

○

آنکھیں گہری سوچ میں چہرہ اُداس
کیا یہ میں ہوں اتنا سنجیدہ اُداس

جشن کی ساعت کہاں تک ٹالیے
روز ہو گا کوئی ہمسایہ اُداس

سوچتا ہے اپنا دکھ کس سے کہے
پھول مُرجھایا ہوا پتّہ اُداس

کچھ چھپانا تھا کہانی میں ضرور
ہو گیا ماحول رنجیدہ اُداس

ایسے نقشے کو میں کیسے مان لوں
ہو نہ جس میں ایک بھی خطّہ اُداس

بذلہ سنجوں کو پشیمانی ہوئی
کر گیا بیتا ہوا لمحہ اُداس
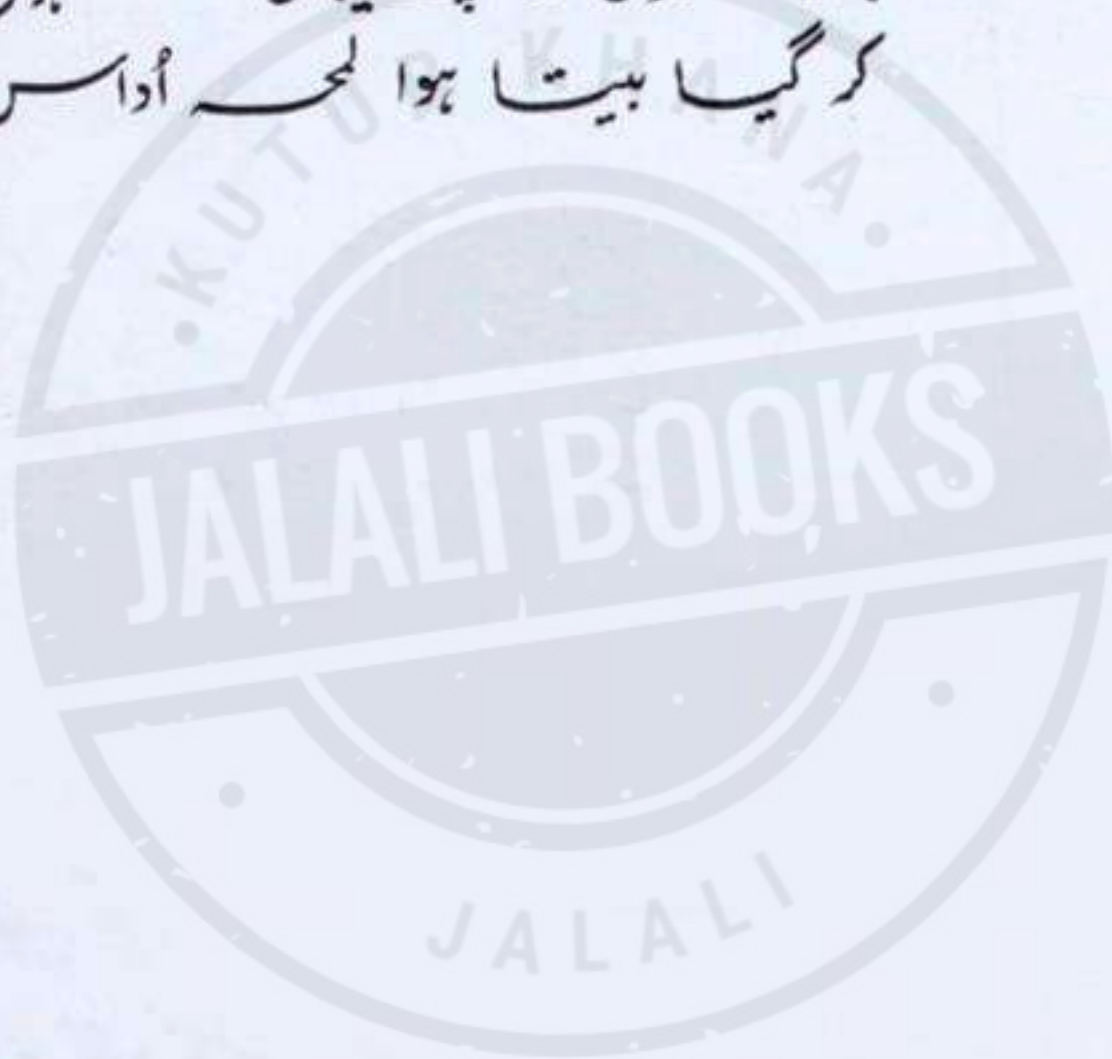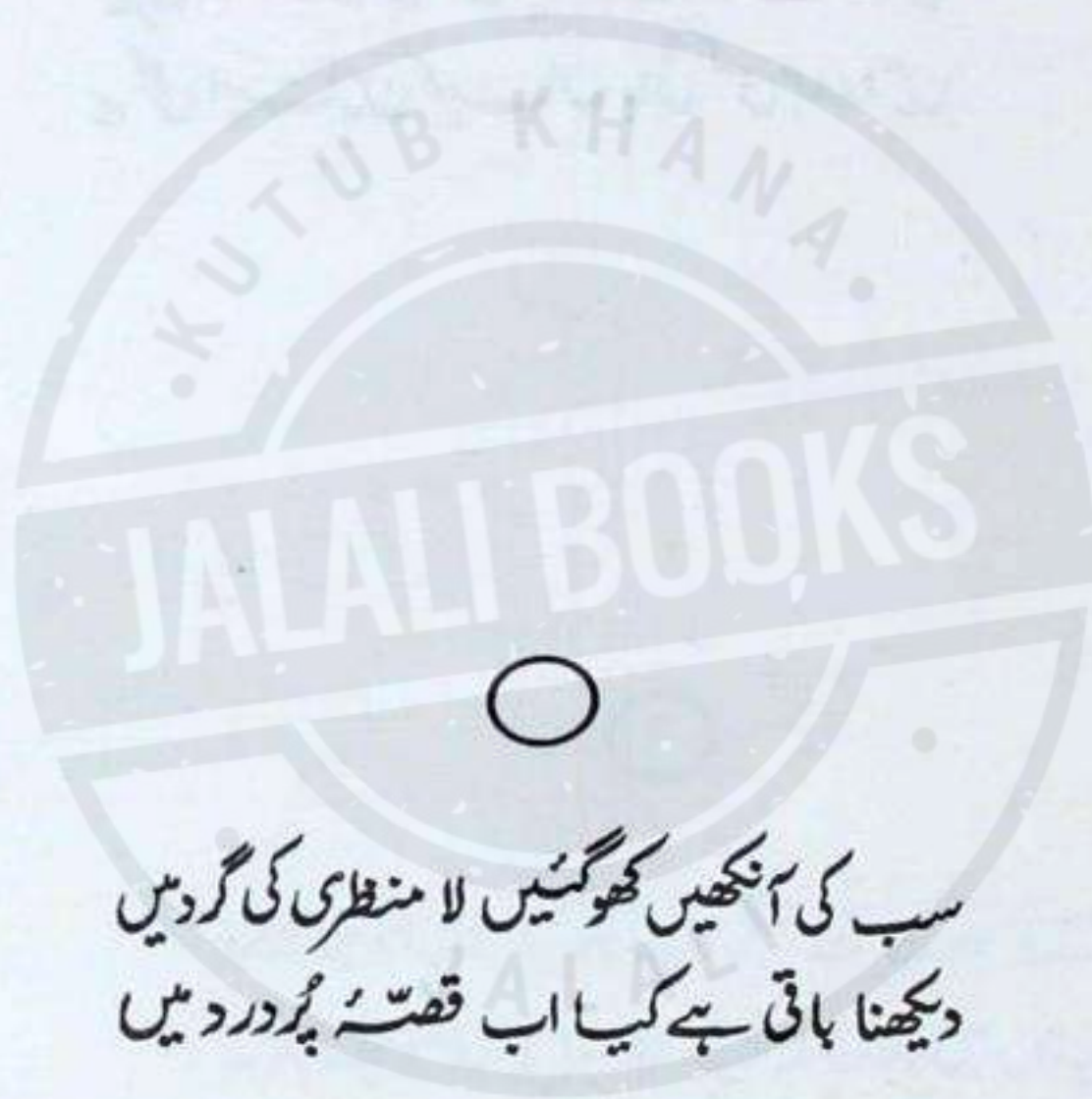
سب کی آنکھیں کھو گئیں لا منظری کی گرد میں
دیکھنا باقی ہے کیا اب قصۂ پُر درد میں

برف باری کا اگر یہ سلسلہ جاری رہا
ہم چہکنا سیکھ ہی لیں گے ہوائے سرد میں

ایک دوجے کو ملانے والی رُت رخصت ہوئی
سارے آئینے ڈھکے ہیں اپنی اپنی گرد میں

خیر سے اس کو ملی ہے جنگلوں کی باگ ڈور
پیڑ اچھے لگ رہے ہیں کیا قبائے زرد میں

اب تو ہم اپنی ہی صحبت کو ترس کر رہ گئے
خواب دیکھا تھا ترا کس لمحۂ بے درد میں

میری آنکھوں کی نمی پہ ہنسنے والے شکریہ
یہ بھی اپنا پن کہاں باقی کسی ہمدرد میں
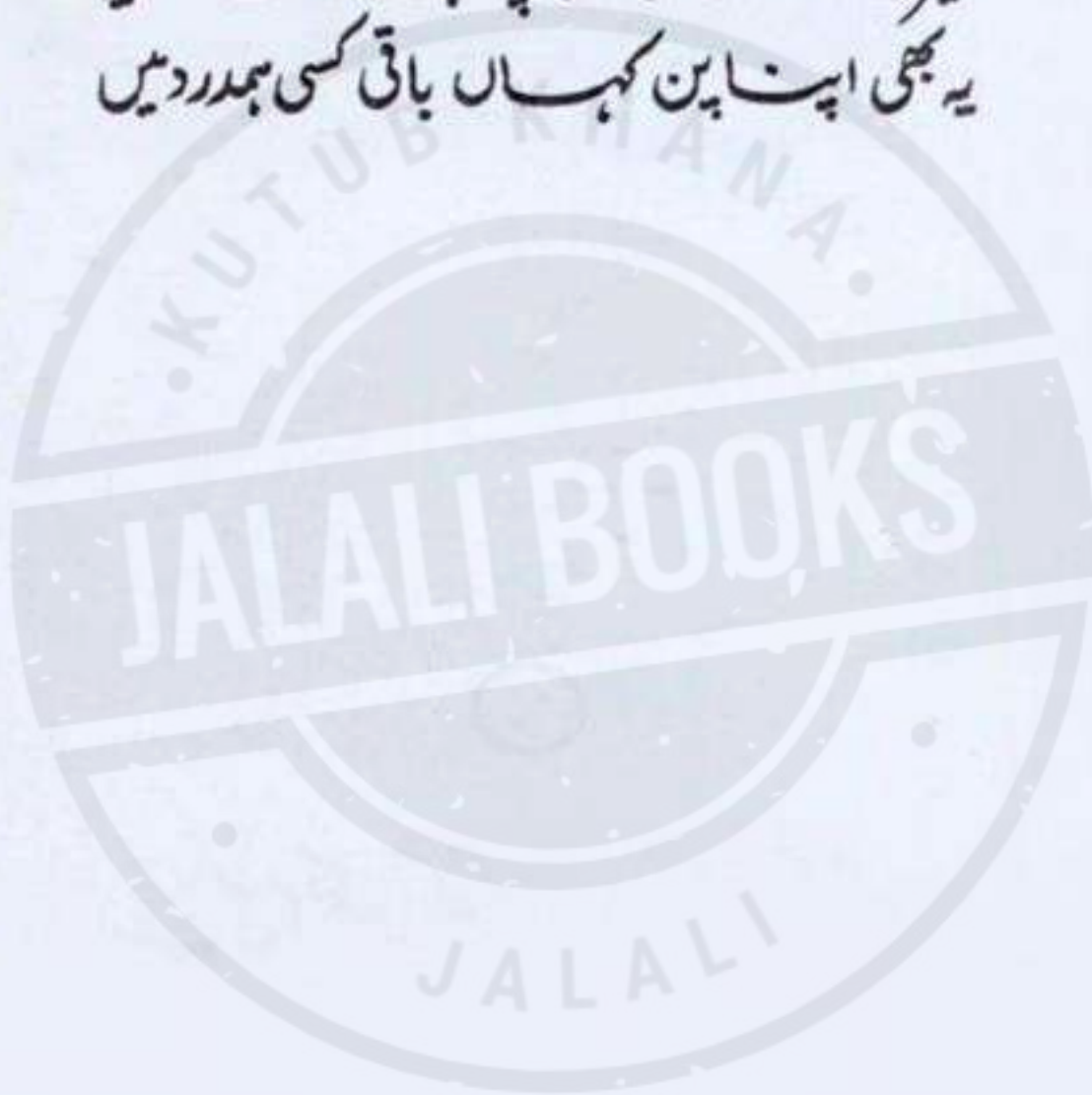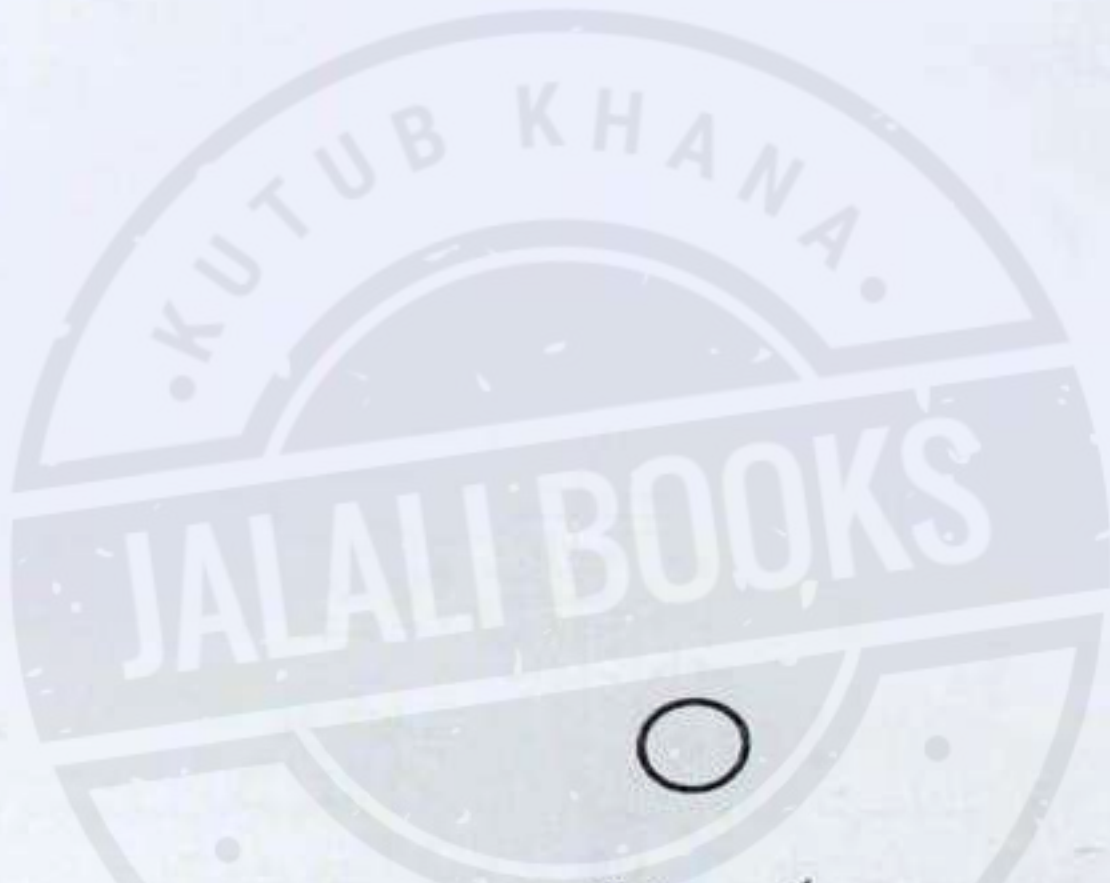
میں سورج تھا مگر اب بجھ گیا ہوں، سوچتا ہوں
یہ میں ہی ہوں کہ کوئی دوسرا ہوں، سوچتا ہوں

کسی گرتی ہوئی دیوار کی ہی چھاؤں مِلتی
مسلسل چلتے چلتے تھک گیا ہوں، سوچتا ہوں

دیے جتنے تھے میرے نام کے سب بجھ چکے ہیں
پرائی آگ میں کیوں جل رہا ہوں، سوچتا ہوں

جو کوئی اور ہوتا گھٹ کے شاید مر ہی جاتا
میں کب سے سانس روکے چل رہا ہوں، سوچتا ہوں

اسی کے حکم سے ہوتے ہیں سارے کام اپنے
مگر میں اپنی خواہش کا خدا ہوں سوچتا ہوں

مرے گھر میں یہ ویرانی سی کیوں چھائی ہوئی ہے
میں زندہ تھا ہی کب جو مر گیا ہوں سوچتا ہوں

مجھے کیوں فکر ہو ہر شخص کے ظلمت کدہ کی
میں کالی رات میں تنہا جلا ہوں، سوچتا ہوں

○
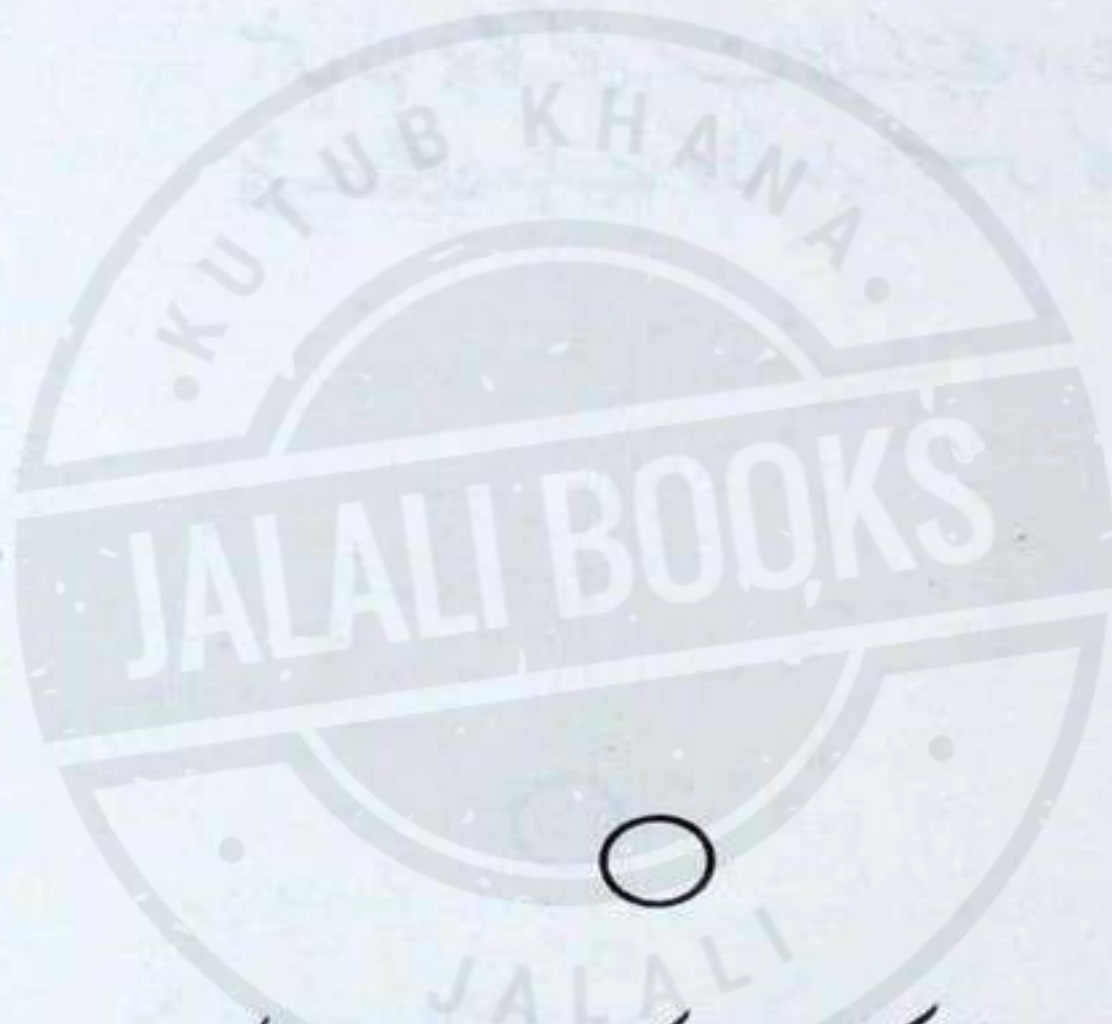
میری آنکھوں میں دمکتا ہوا چہرہ اس کا
کب سے جزدان میں رکھّا ہے صحیفہ اس کا

وہ پرندہ جسے جنگل کی ہوا بھی نہ لگی
لوگ ہر شاخ سے دکھلائیں گے رشتہ اس کا

صاف بچ جاتے مرے ہاتھ قلم ہونے سے
کاش میں نے بھی لکھا ہوتا قصیدہ اس کا

کون ہے جو اسے کہتا ہے اندھیروں کا نقیب
شام ہوتی ہے تو کھِل اٹھتا ہے چہرہ اس کا

رہ گزر یاد کی سونی ہوئی مدّت گزری
اس گلی میں کبھی کھلتا تھا دریچہ اس کا

ہنس رہا ہوگا کسی شاخ کے پیچھے سورج
پیڑ سے چھین رہا ہے کوئی سایہ اس کا

○
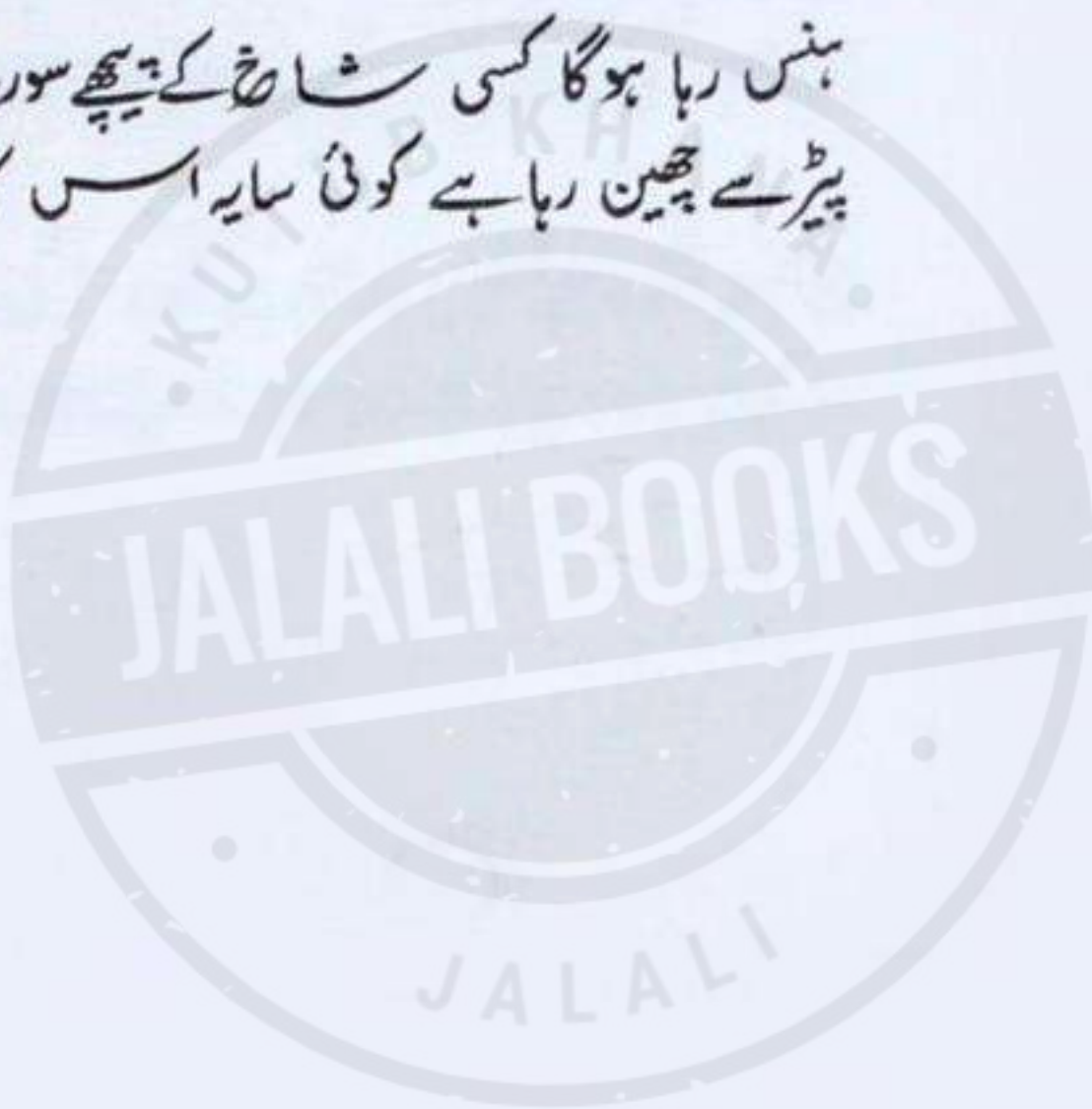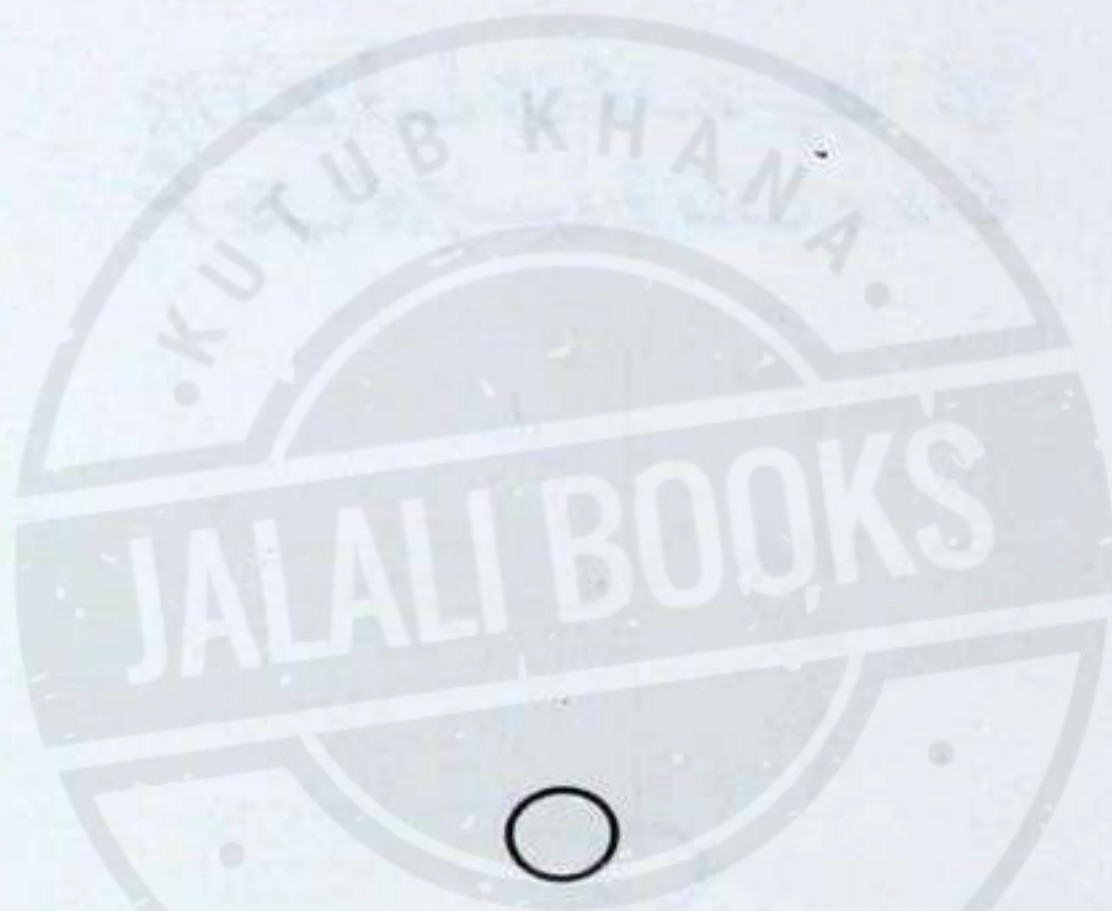
وہ کیا ہے کون ہے یہ انکشاف ہو نہ سکا
مگر کچھ اس کی رضا کے خلاف ہو نہ سکا

کسی کی ضرب سے ٹوٹے گی یہ چٹان ضرور
مری صدا سے تو اس میں شگاف ہو نہ سکا

ہزار دیپ جلائے سیاہ راتوں میں
کھنڈر کھنڈر ہی رہا کوہ قاف ہو نہ سکا

نظر کو ڈھانپ لیا مصلحت کی چادر میں
کسی سے پھر تو مرا اختلاف ہو نہ سکا

تمام شہر ہی اک دوسرے کا مجرم ہے
کبھی کسی سے مگر اعتراف ہو نہ سکا

ہزار آئینے ٹوٹے ہیں مجھ سے پہلے بھی
مگر جناب کا چہرہ تو صاف ہو نہ سکا

○
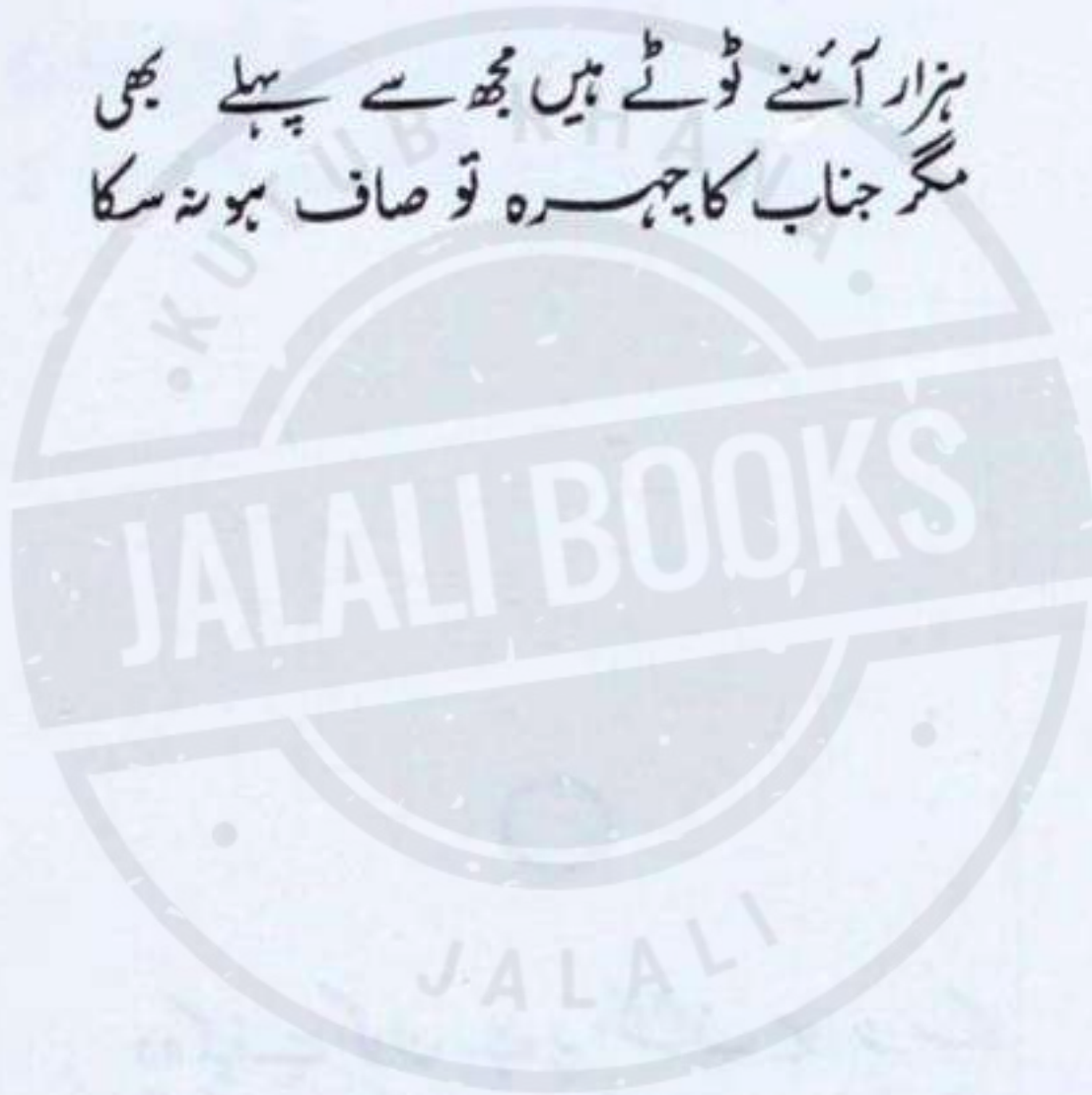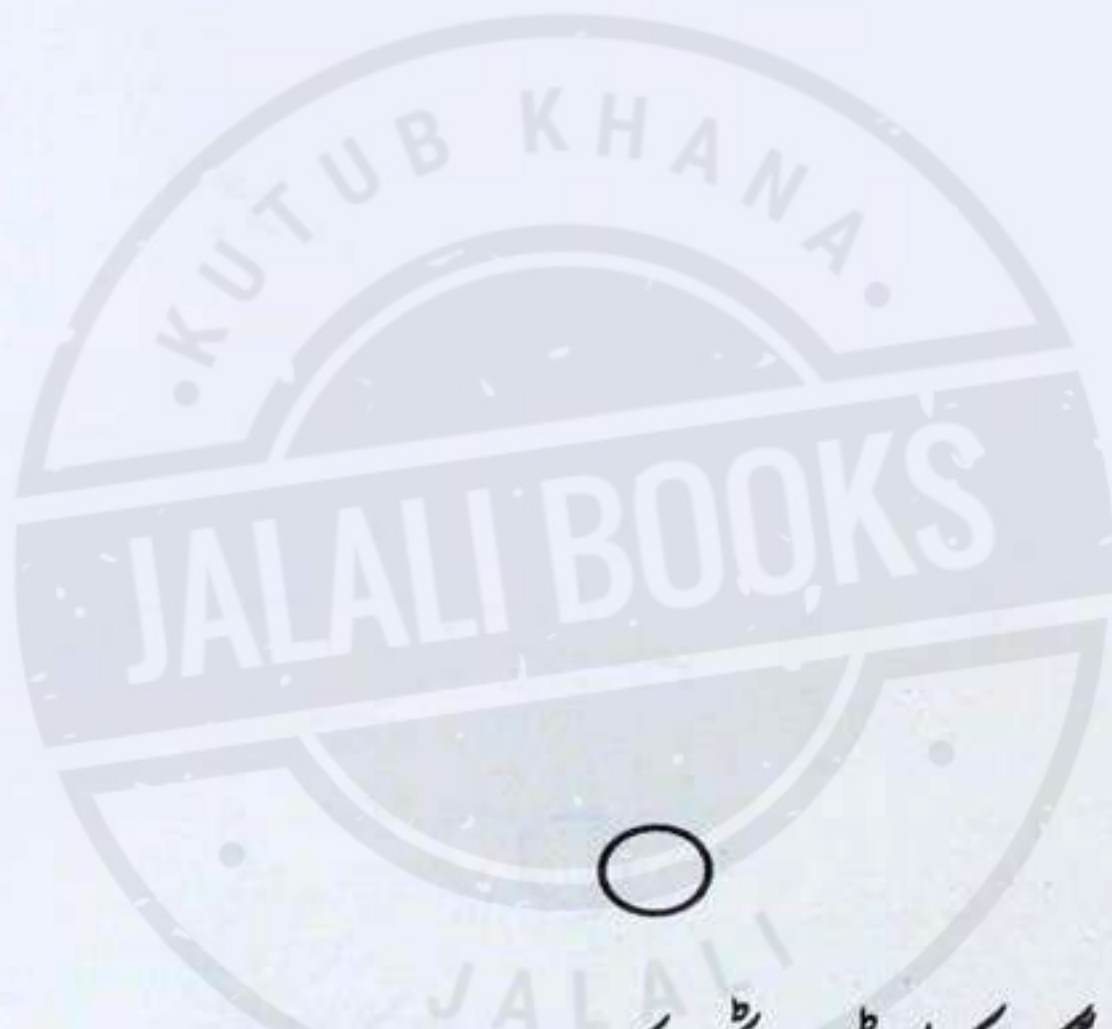
آگ کی لپٹیں اٹھیں کمرے سے اور دالان سے
کھیلنا مہنگا پڑا ہے سرد آتش دان سے

پیاس کے ماروں کے تلوؤں سے لہو رسنے لگا
کوئی چشمہ پھوٹ ہی پڑتا ہے ریگستان سے

ذہن پر چھانے لگا ہے خوشنما منظر کا سحر
سبز پتے آ رہے ہیں اڑ کے نخلستان سے

بد دُعائیں لگ گئیں کیا جانیے کس پھول کی
ہاتھ زخمی ہو گیا ٹوٹے ہوئے گل دان سے

مختلف ہے اس کی دلّی سے ہمارا شہر کیا
کیوں اُداسی مانگیے اب میرؔ کے دیوان سے

روکتی کیوں ہے مجھے پھولوں بھری یہ رہ گزار
میں سلگتی ریت پر چلتا رہا ہوں شان سے
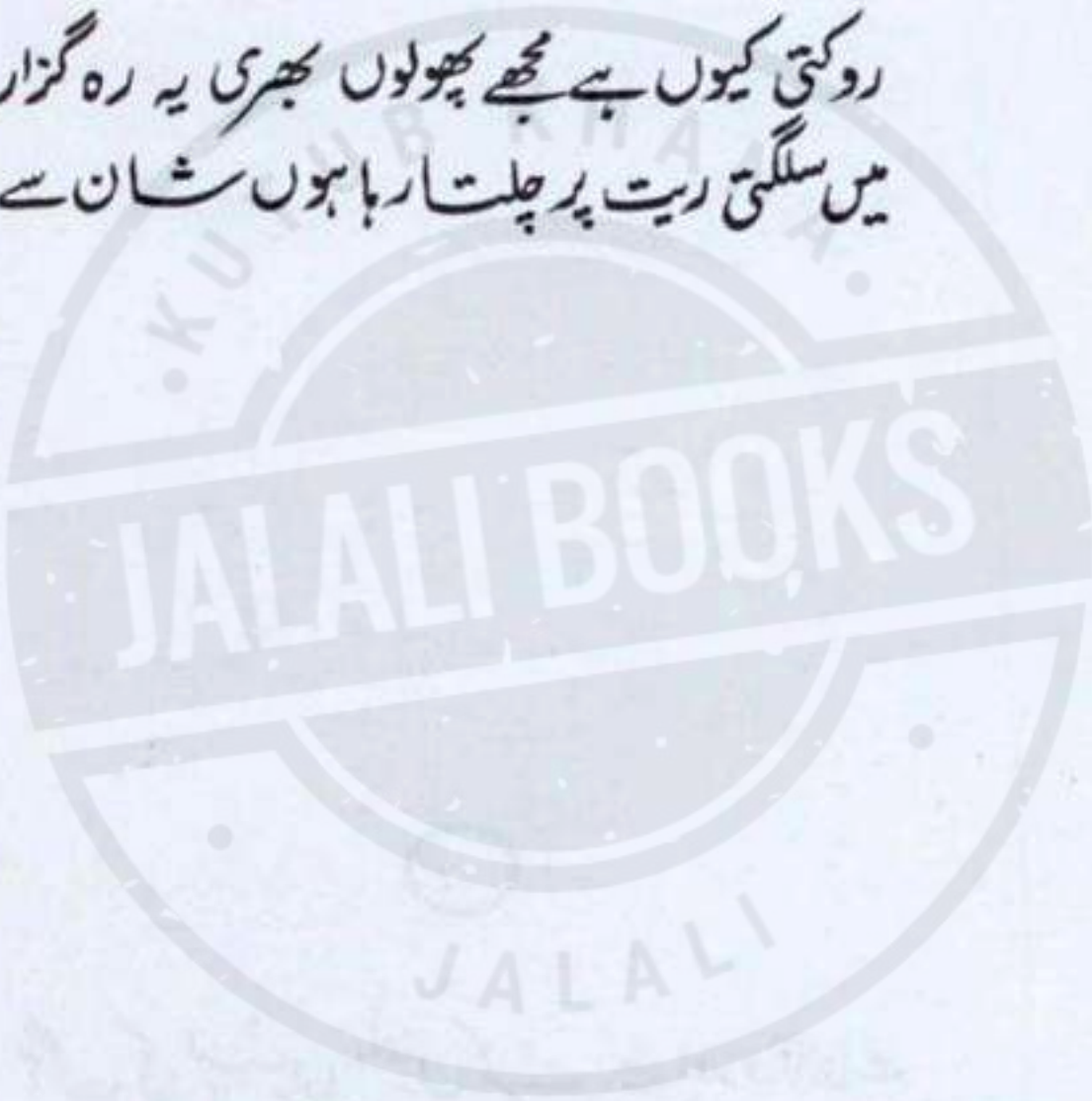
کیوں کہا جائے دلِ ویران میں کچھ بھی نہیں
ہاں! ندی کے جیسا ریگستان میں کچھ بھی نہیں

دیکھیے تو آگ پھیلی جا رہی ہے ہر طرف
آپ کہتے تھے کہ آتش دان میں کچھ بھی نہیں

فرش پر بکھرے پڑے ہیں مختلف رنگوں کے پھول
اب مرے ٹوٹے ہوئے گلدان میں کچھ بھی نہیں

جانے کب سے رِس رہے ہیں اپنی بینائی کے زخم
طاق پر رکھے ہوئے جزدان میں کچھ بھی نہیں

اِک چھلاوہ ہے یہ پتّوں کے لرزنے کا سماں
حبس کے مارو! کُھلے میدان میں کچھ بھی نہیں

مجھ کو خلعت کی ضرورت ہے نہ منصب کا خیال
مجھ کو کیا کہنا کسی کی شان میں کچھ بھی نہیں

O
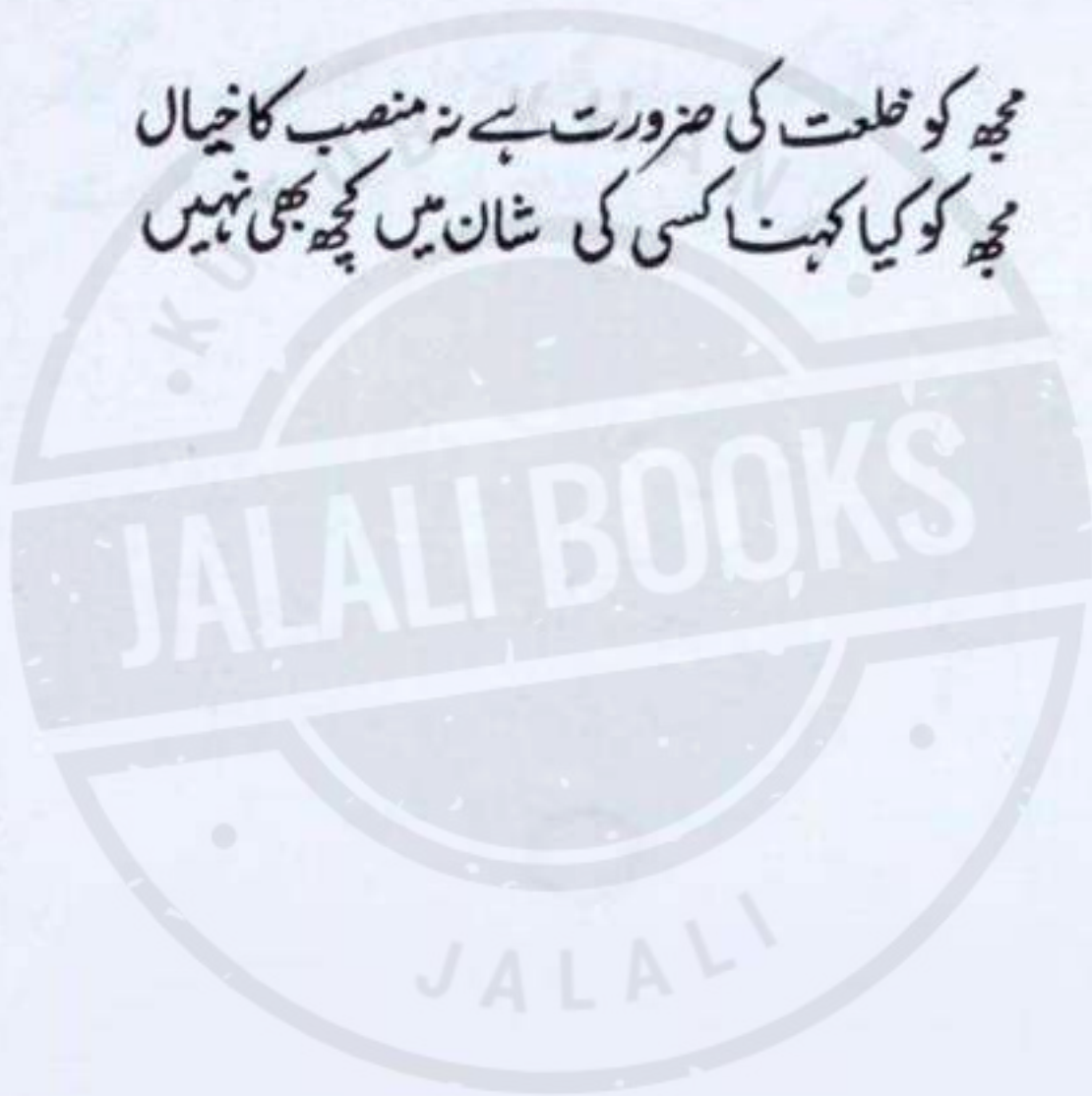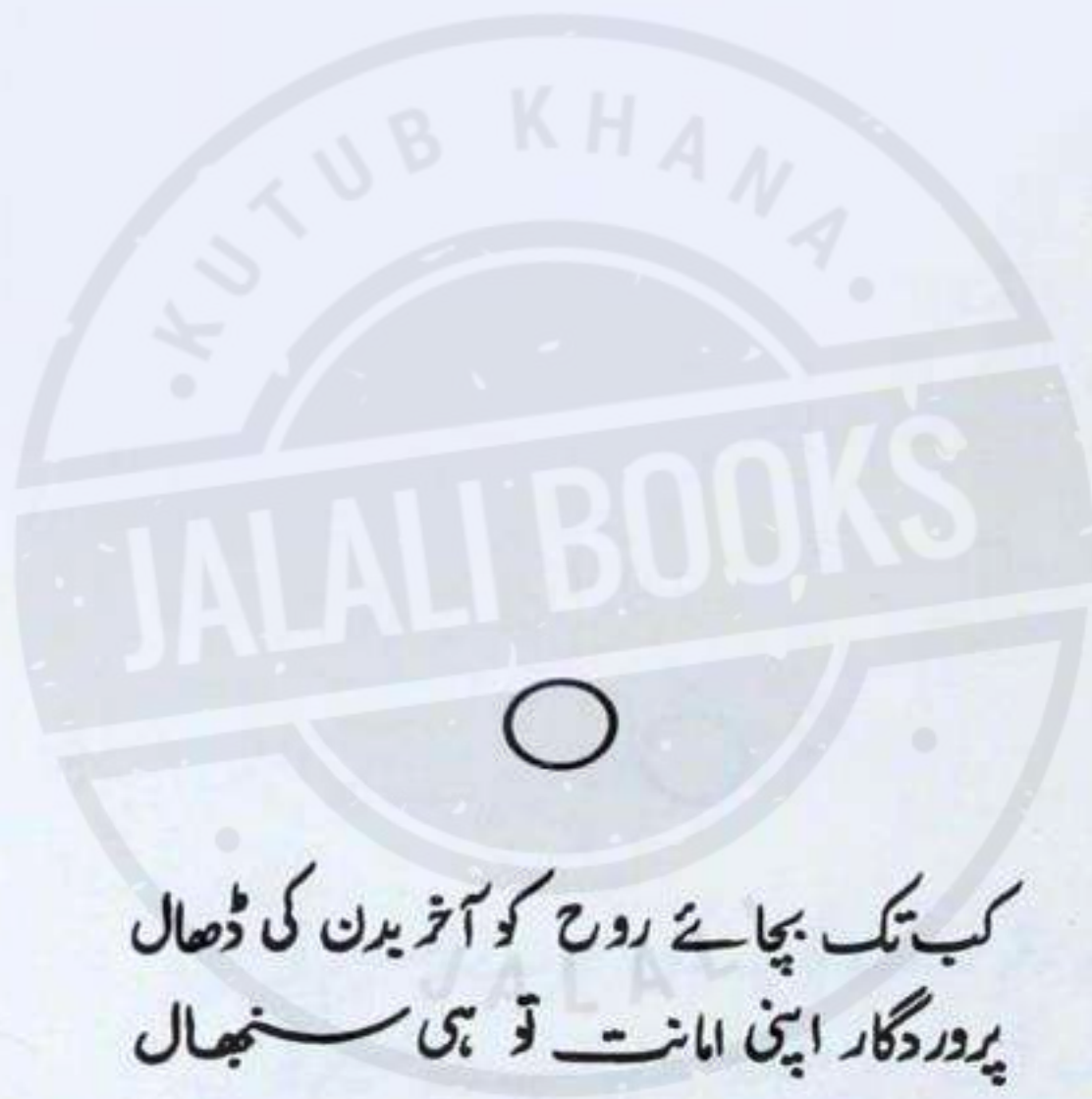
کب تک بچائے روح کو آخر بدن کی ڈھال
پروردگار اپنی امانت تو ہی سنبھال

تنگ آگئے تھے ہم بھی درختوں کے جبر سے
پتّوں کو توڑ ڈالے ہوا کی کہاں مجال

کوئی تو رنگ چڑیوں کے جی کو لبھائے گا
اس نے بچھا رکھے ہیں ہزاروں طرح کے جال

رکھیے شکار گاہ میں جینے کا حوصلہ
کیوں بے تحاشہ بھاگیے جیسے کوئی غزال

کچھ تو بڑھے گی اوس کے قطروں کی زندگی
ہوگا کبھی تو قہر کے سورج کا بھی زوال
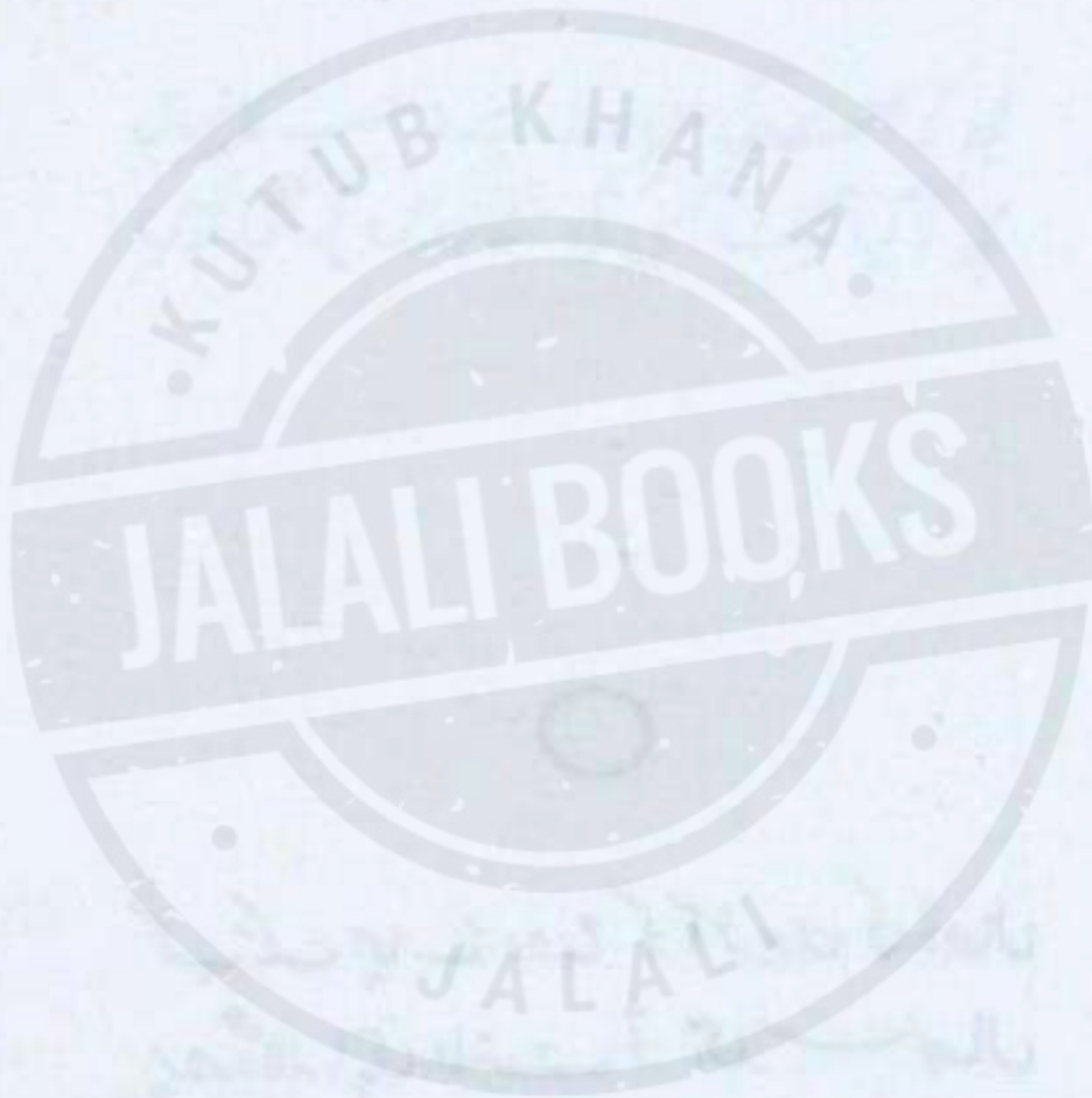
کیا ضروری ہے کہ پھولوں سے لدی ہو ہر شاخ
کیوں نہ محفوظ ہوں اب دشت کی ویرانی سے

○
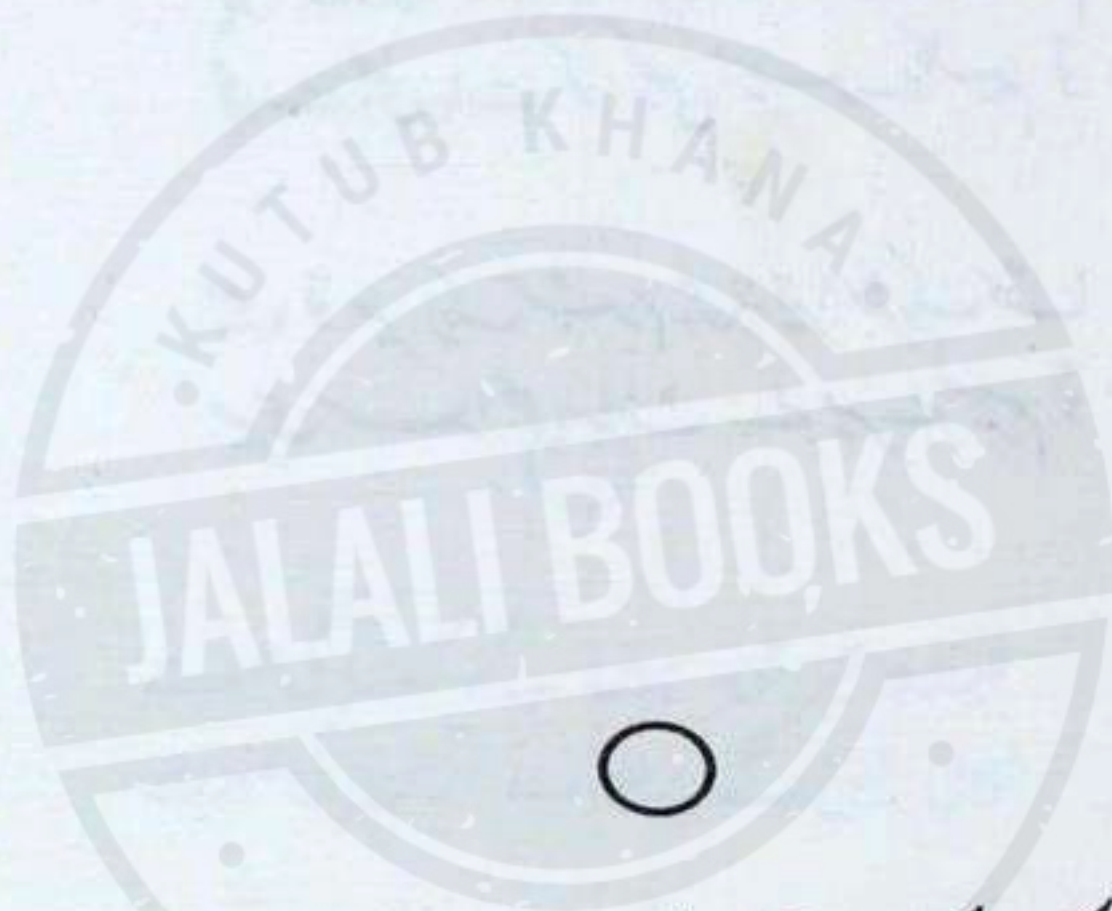
کچھ رحم کر دے مجھ پہ بھی میرے رحیم تو
میں اک حقیر بندہ ہوں سب سے عظیم تو

شاید کہ لوگ مانگیں تری فتح کا ثبوت
مجھ کو بھی اپنے ساتھ لیے جا غنیم تو

مُرجھا رہے ہیں باغ میں سب غنچے ادھ کھلے
کیوں جنگلوں میں آ گئی بادِ نسیم تو

ہاں ! میں نے بارشوں کی دُعا کی تو ہے مگر
اتنا بھی مت برس مرے ربِّ کریم تو

کانٹے بھی کس کو ملتے ہیں پھولوں کا ذکر کیا
مجھ کو تباہ کر دے مذاقِ سلیم تو

کچھ مندمل تو ہوں مری خاموشیوں کے زخم
مجھ سے بھی بات کر کبھی میرے کلیم تو

میں تو ہر ایک جرم میں تیرا شریک تھا
میری سزا بھی بانٹ لے میرے سہیم تو

خمیدہ تیر بھی ہوں گے کمان کی صورت
نکال لیں گے پرندے اڑان کی صورت

وہ رونقیں بھی تری روشنی کے ساتھ بجھیں
اب آکے دیکھ لے میرے مکان کی صورت

مخالفت تو ہواؤں نے خوب کی لیکن
دعا کے ہاتھ کھلے بادبان کی صورت

جو کل یقین دلاتا تھا میرے ہونے کا
وہی نکال رہا ہے گمان کی صورت

○

صبح آئی بھی نہیں خواب ہمارے ٹوٹے
دیکھتے دیکھتے کتنے ہی ستارے ٹوٹے

ان دکانوں میں کہاں اپنی اُداسی کا علاج
کچھ کھلونے ہیں مگر سارے کے سارے ٹوٹے

خوشنما باغ جلے، وادیاں ویران ہوئیں
جھیل میں غرق ہوئے کتنے شکارے ٹوٹے

میں نے خود مول کہاں لی ہے رقابت شب کی
میرے قدموں میں گرے آتے ہیں تارے ٹوٹے

○
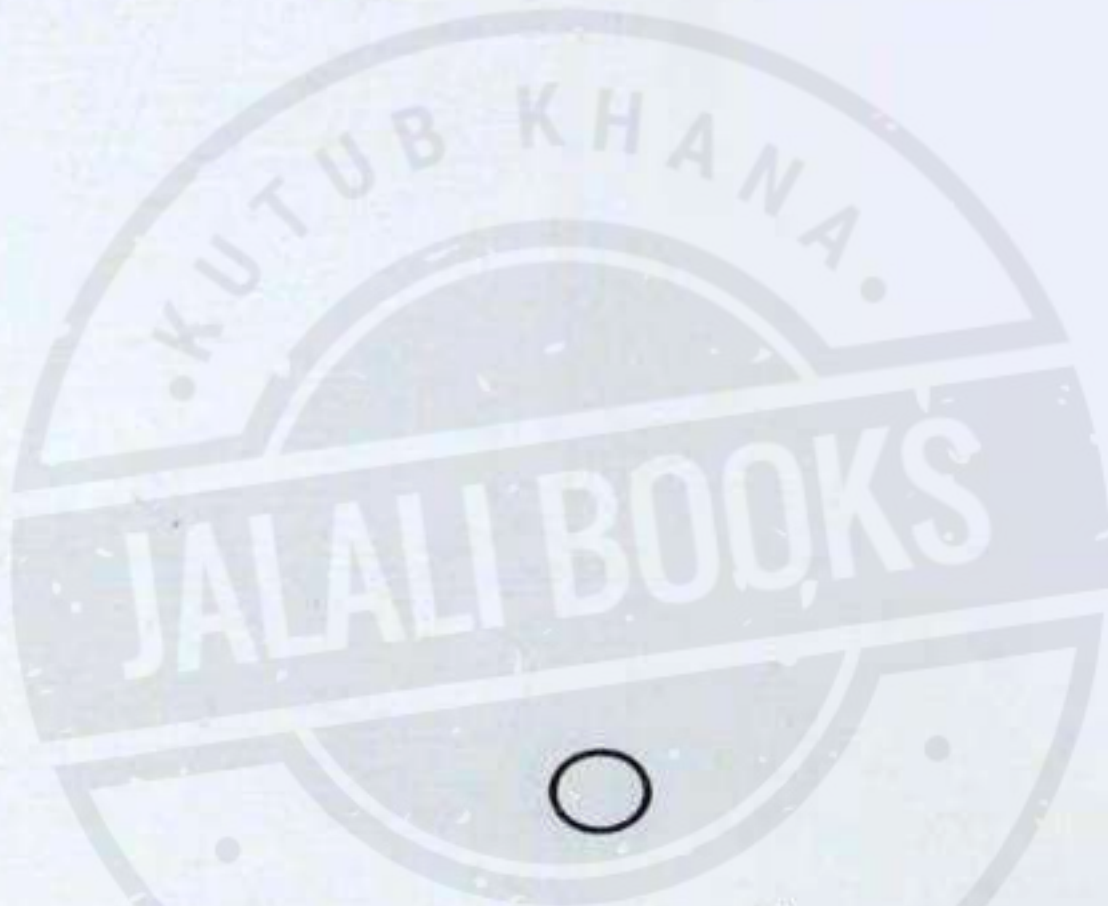
چمکتے لفظوں کی عصمت پہ حرف آتا ہے
یہاں قلم کی شہادت پہ حرف آتا ہے

نظر اٹھائیں تو گستاخ کہہ دیے جائیں
زباں کھلے تو عقیدت پہ حرف آتا ہے

مرے خلوص کی سچّائی پر یقین تو کر
ترے خیال کی وسعت پہ حرف آتا ہے

لُٹا کے روشنی اپنی گناہ گار نہ ہو
یہاں چراغ کی حرمت پہ حرف آتا ہے

مجھے خوشی نہ ملی یہ گلہ تو کرنا تھا
مگر کسی کی سخاوت پہ حرف آتا ہے
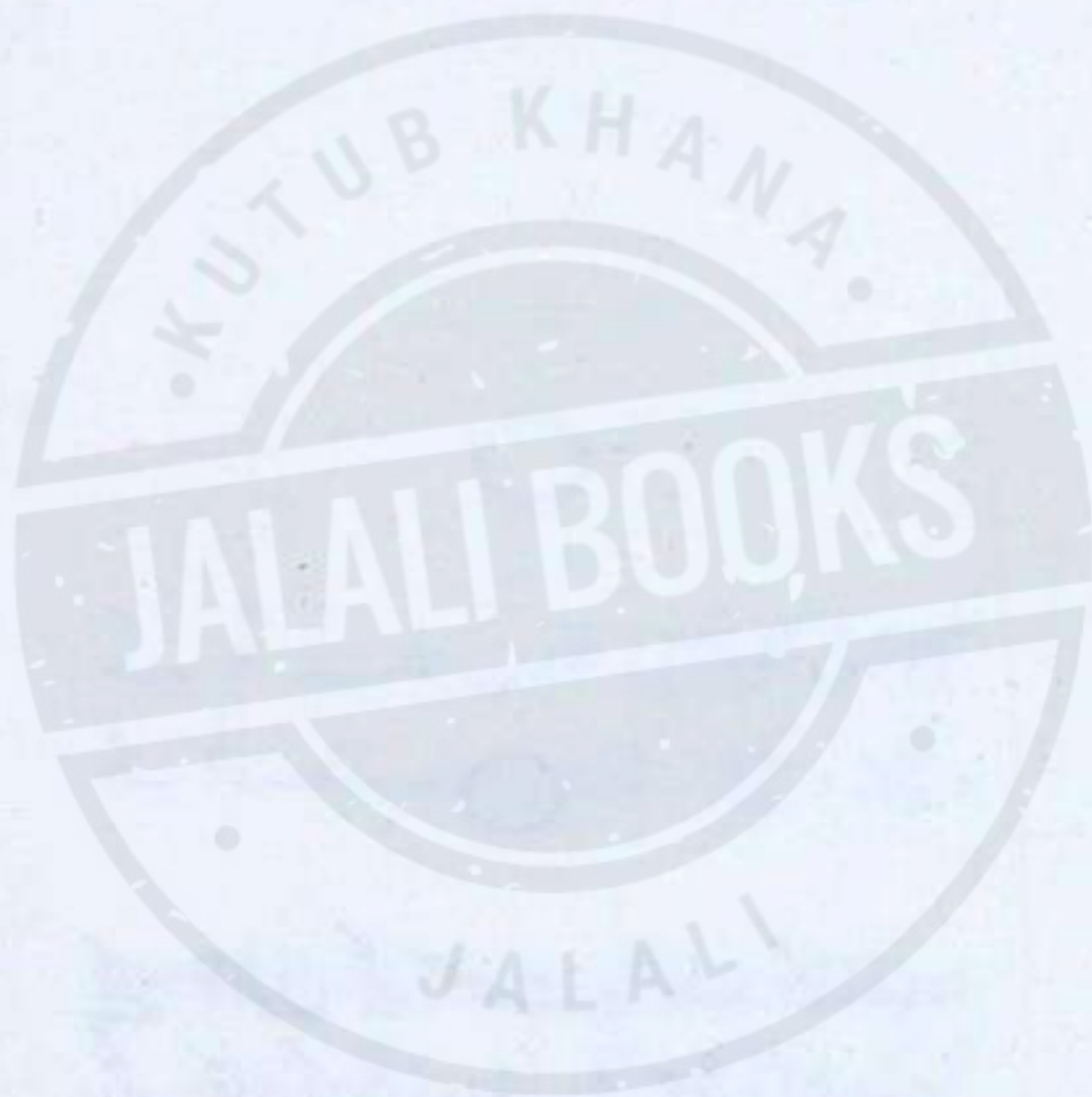
اک جزیرے پر اترتے چاند کا جادو نہ پوچھ
میں سمندر سے اکیلا برسرِ پیکار تھا

○
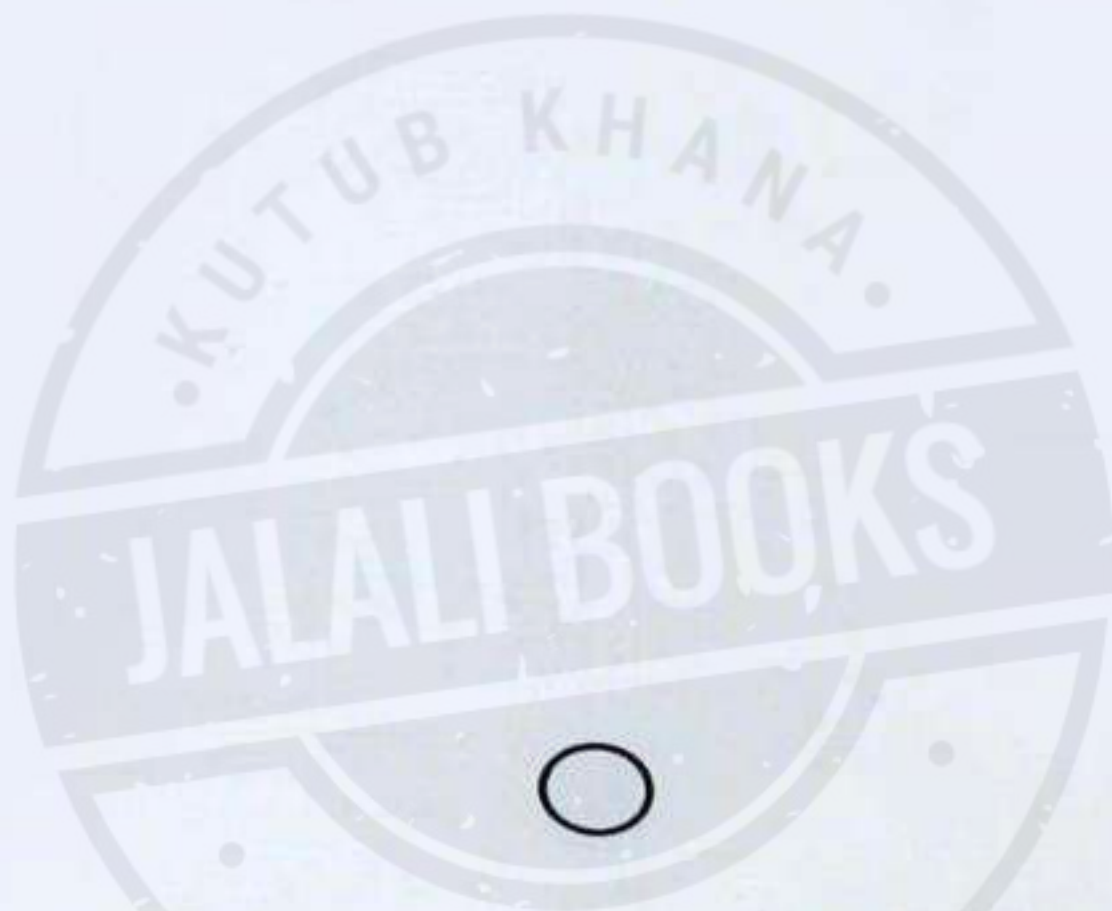
حسیں منظر کی قیمت ہی نہیں ہے
تو یہ سمجھو بصارت ہی نہیں ہے

زمانے کے لیے کب تک جیے وہ
جسے اپنی ضرورت ہی نہیں ہے

یہاں تو اب سوائے میر جعفر
کسی کی کوئی وقعت ہی نہیں ہے

زیاں سجدوں کا ناحق کیوں کریں جب
تمہیں پاسِ عبادت ہی نہیں ہے

تمام آزادیاں ہیں دل کو بس اِک
دھڑکنے کی اجازت ہی نہیں ہے

یہ بے نیازی کہاں سب کو راس آتی ہے
خبر میں رہنا مگر خود سے بے خبر رہنا

سارے منظر پہ اترنے لگی سرشاری پھر
سرخرو ہونے لگی شاخِ گنہگاری پھر

آپ تو پیار کو کہتے تھے عبادت ہے یہ
کیسے ہونے لگی سجدوں کی خریداری پھر

جشن برپا ہے یہاں صبح کی آمد پہ، اُدھر
ہو رہی ہے کسی شب خون کی تیاری پھر

پھر ترے لمس کے احساس نے انگڑائی لی
جاگ اٹھی ہے رگ و پے میں کوئی چنگاری پھر

لوگ پھر سائے کی صورت کو ترس جائیں گے
دیکھتا ہے ترا اندازِ شجر کاری پھر

برسات تک میں لوٹ سکوں گا یقیں نہیں
روتے بھی دو لپٹ کے پرانے مکان سے

O

گھپ اندھیرا ہے یہاں، کون سا در کھلتا ہے
چاند جس سمت ہو دروازہ ادھر کھلتا ہے

اور کچھ بھی نہیں اس لمبے سفر کا حاصل
اک دریچہ جو سرِ راہ گزر کھلتا ہے

عین ممکن ہے کہ اس گھر میں مرا دم گھٹ جائے
کوئی دیوار ہی گرتی ہے نہ در کھلتا ہے

اپنی چہکار میں رونے کی صدا کس نے سُنی
کب پرندوں پہ کوئی رازِ شجر کھُلتا ہے

مجھ پہ کس درجہ ہیں سورج کی عنایات نہ پوچھ
میری دہلیز پہ ہی دھوپ کا سر کھُلتا ہے

میرے محسن سے کہو اپنی ردا لے جائے
پاؤں ڈھکنے بھی نہیں پاتے کہ سر کھُلتا ہے

O
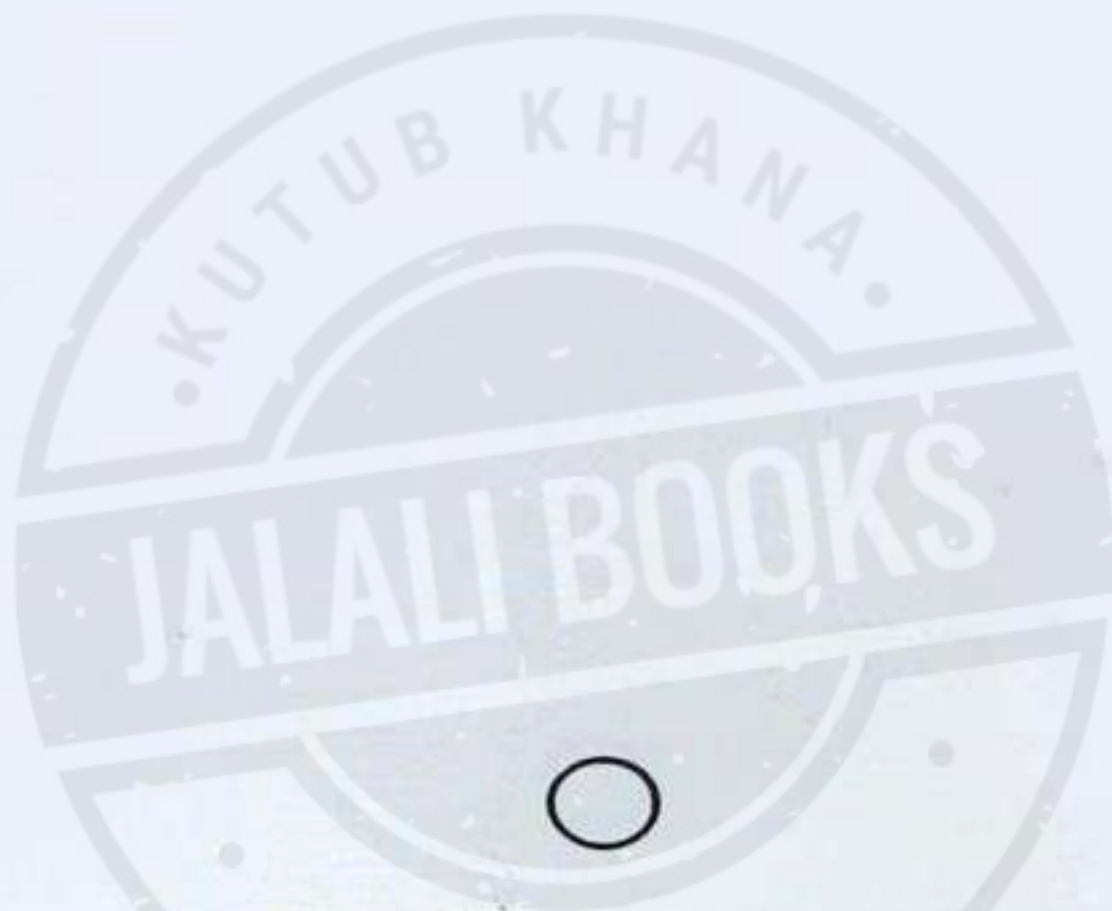
اپنی ہی مٹی میں گہرے زخم بونے کا جواز!
ڈھونڈتی پھرتی ہیں آنکھیں خون رونے کا جواز!

کاغذوں کے چند ٹکڑوں پر یہی دو چار شعر
اور کیا اب رہ گیا ہے اپنے ہونے کا جواز!

کیسے کیسے پھول قدموں میں کھلے ہیں دیکھ تو
ایسے موسم میں ہے کیا غمگین ہونے کا جواز!

میں وہ پاگل جس نے دنیا بھر کو دیوانہ کیا
یوں گلے کے ہار میں کانٹے پرونے کا جواز!

اوس سے دُھلتی کہاں ہے یاد کے چہرے کی گرد
سردیوں کی رات میں پلکیں بھگونے کا جواز!

جس نے پھیلائی بساطِ کہکشاں رنگ و بو
وہ ہے خود ہی اس جہاں میں کچھ نہ ہونے کا جواز!

○
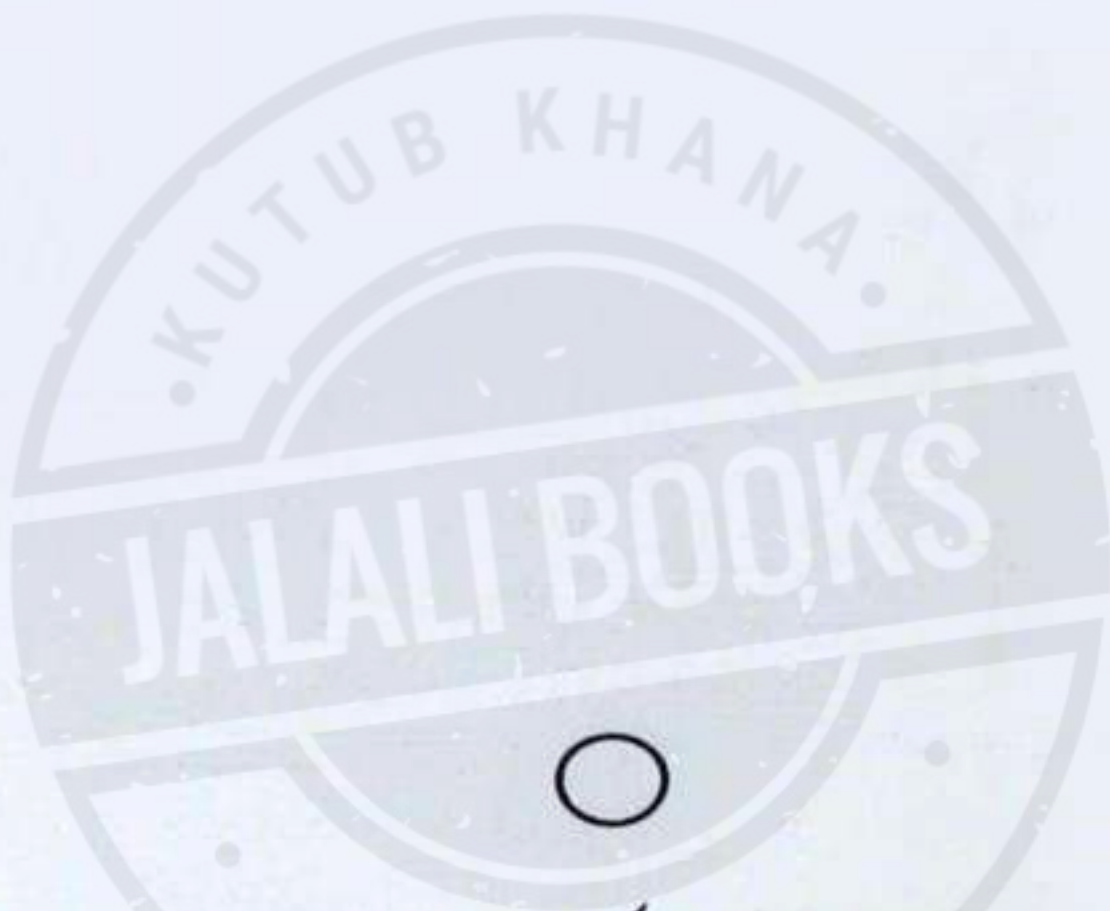
ضرور بھول ہوئی ہے کہیں سنانے میں
یہ اقتباس تو تھا ہی نہیں فسانے میں

بڑے گھروں میں رہی ہے بہت زمانے تک
خوشی کا جی نہیں لگتا غریب خانے میں

مرے لیے ہی ہوا اہتمامِ جشن مگر
جگہ نہ مل سکی مجھ کو ہی شامیانے میں

فریفتہ ہے ہر اک شخص اپنی صورت پر
میں آگیا ہوں یہ کیسے فریب خانے میں

اندھیرے اور گھنے حد سے بھی گھنے ہوں گے
وہ چوک اب کے ہوئی ہے دیا جلانے میں

کچھ اثر اس پہ نہیں خون سے خط لکھنے کا
رائیگاں ہوگئی اب کے بھی عبادت میری

مرے پاس کوئی عصا ہے نہ تیر
مگر وہ علیٰ کُلِّ شَیٔ قدیر

شہنشاہ کا تاج خطرے میں ہے
پیادوں کے آگے جُھکا ہے وزیر

اسے میرے زخموں کی پروا ہو کیوں
نہ آنکھیں ہیں جس کی نہ جس کا ضمیر

ستارے بچھے ہیں ہر اک گام پر
بڑا بخت والا ہے شب کا سفیر

جہاں ساری بستی تہی دست ہو
وہاں کس کے در پر صدا دے فقیر
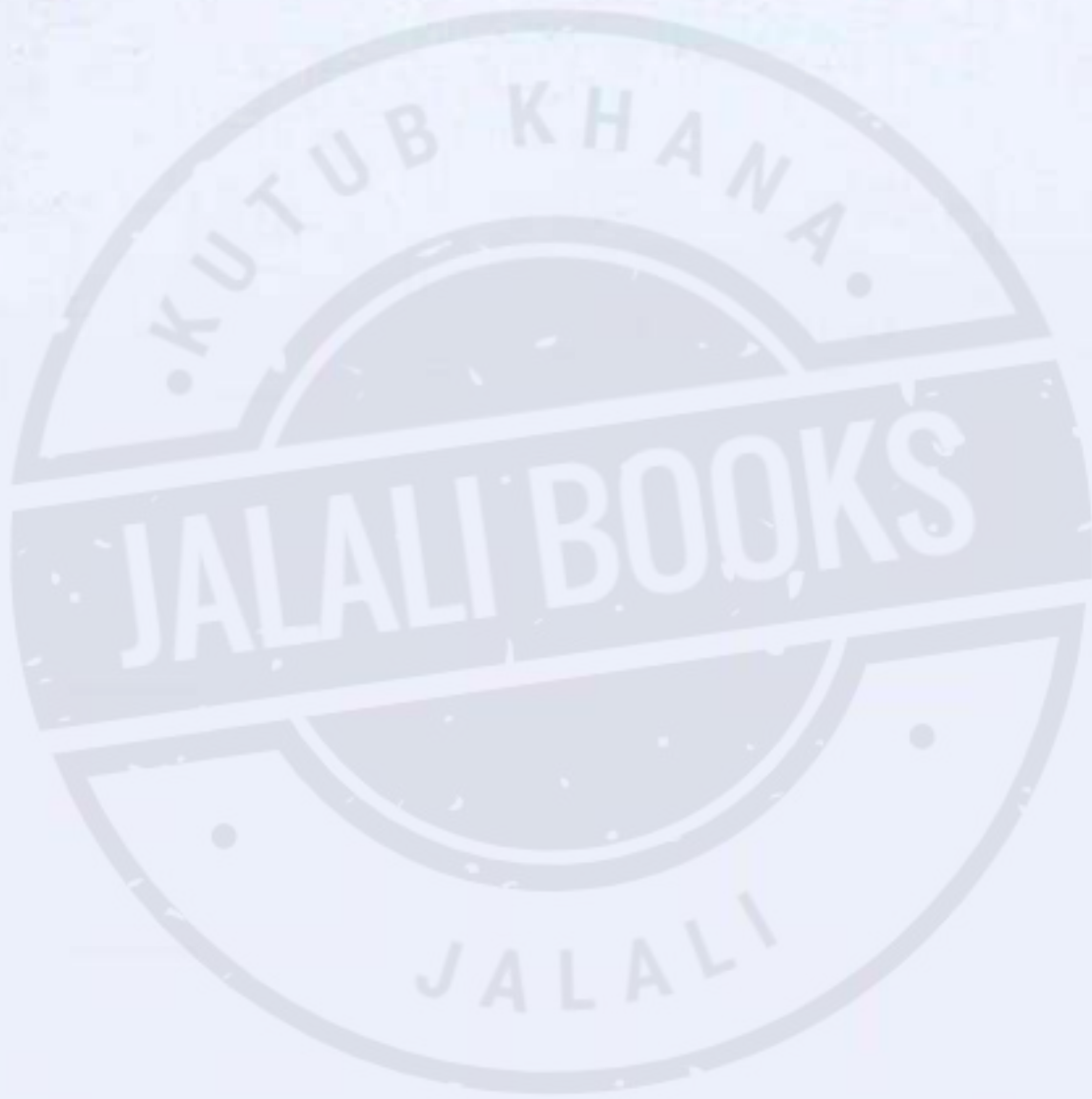
بہت جھکا ہوا جب آسمان ہوتا ہے
تو سر اٹھانا بھی اک امتحان ہوتا ہے

○
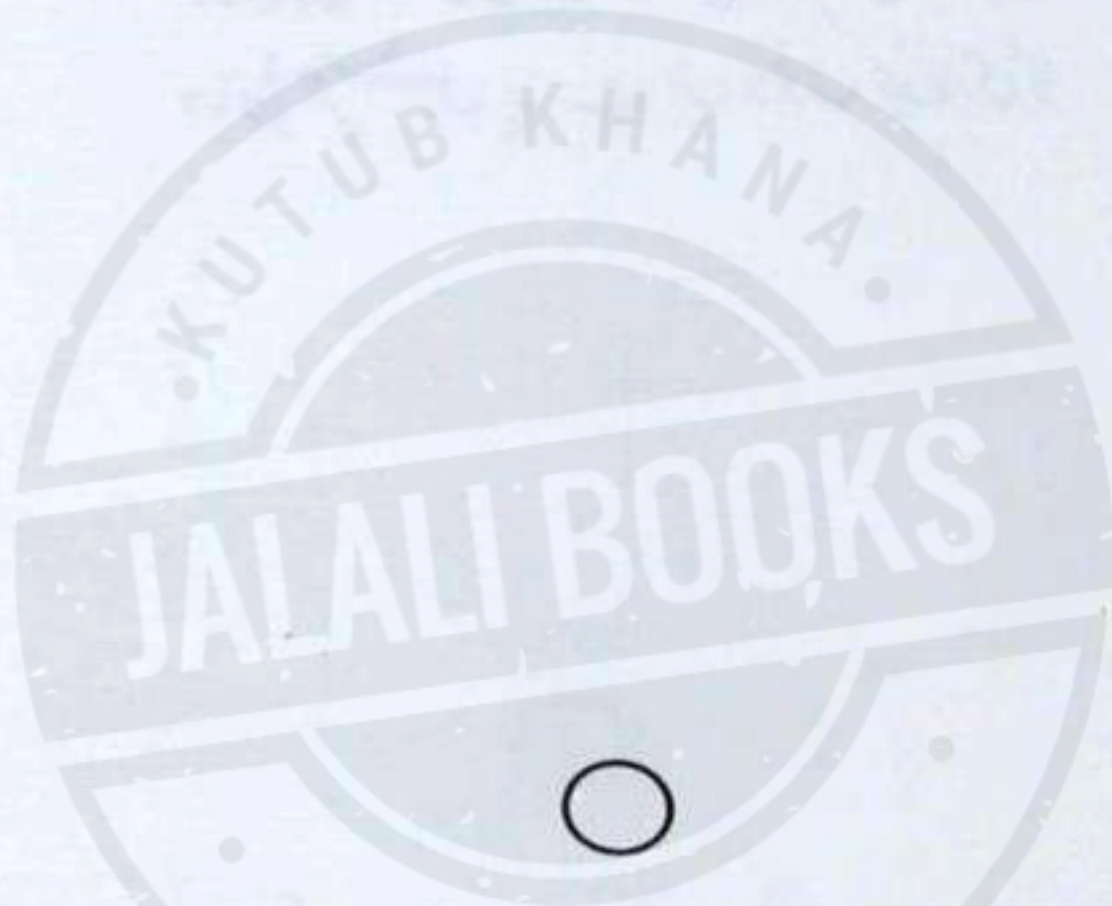
مقابلہ یہیں کرنا ہے برف باری کا
اب انتظار نہیں دھوپ کی سواری کا

ہزار دھبّے ہیں دن کے سفید دامن پر
گلہ ہو کیوں کسی شب کی سیاہ کاری کا

بہت سے لوگ ہیں جن پر نظر نہیں تیری
مجھے دماغ کہاں دل کی بے قراری کا

زمانے بعد یوں سج دھج کے شام کیا آئی
نشہ سا چھانے لگا پھر گناہ گاری کا

ملے نجات مجھے خانۂ تذبذب سے
کوئی سرا تو چمک اُٹھے راہداری کا

قبول ہی نہیں کرتا کسی نظر کی زکوٰۃ
دماغ عرش پہ ہے ان دنوں بھکاری کا

O
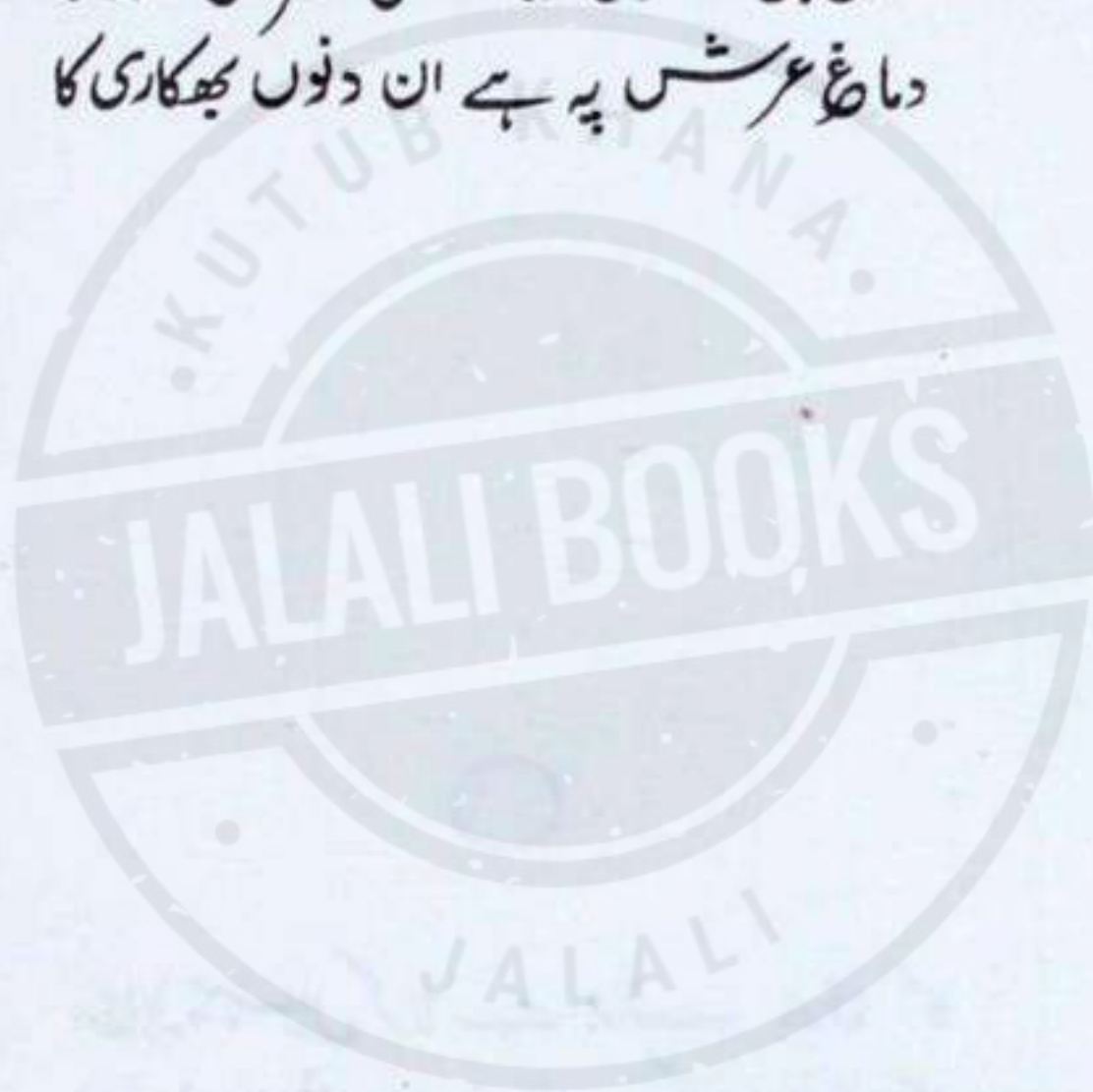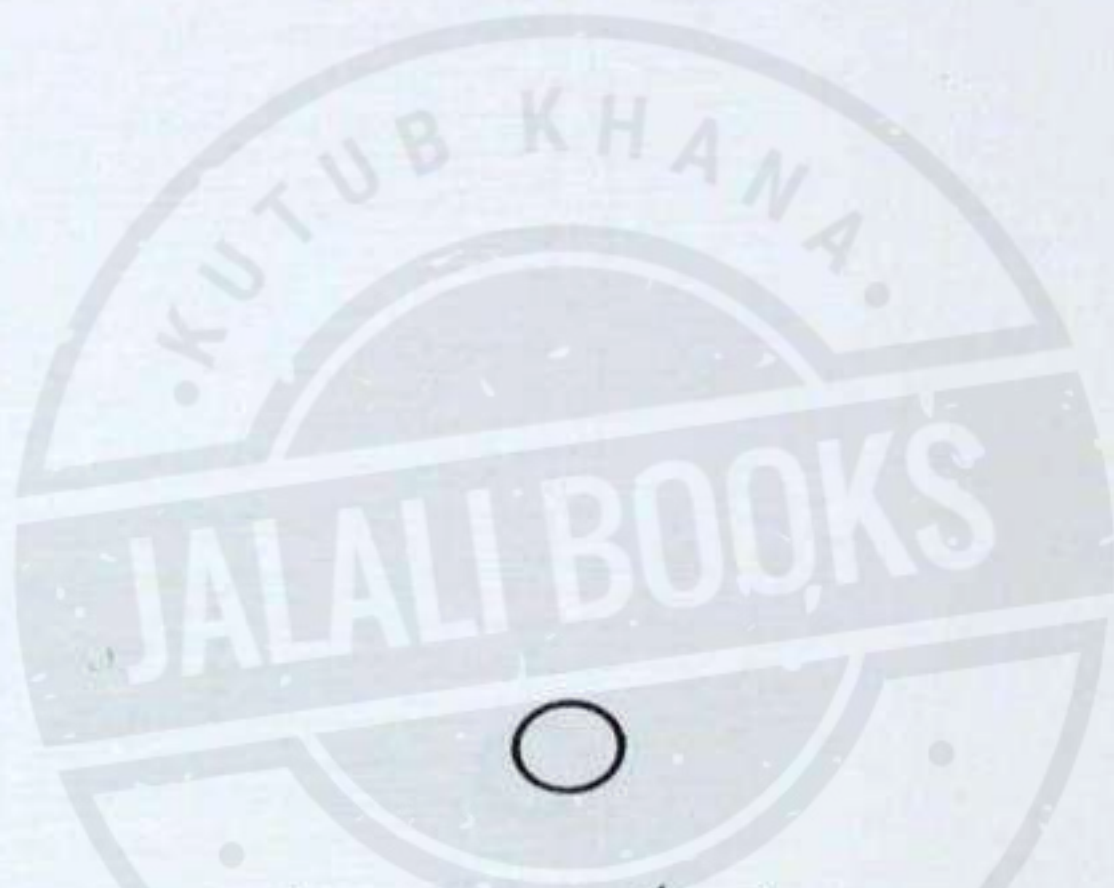
پھول اور رنگ کی سوغات سے دکھ ہوتا ہے
کیا ہوا ہے مجھے ہر بات سے دُکھ ہوتا ہے

اپنے اشکوں سے میں لکھتا ہوں مقدّر اپنا
کیوں ستاروں کو مری ذات سے دُکھ ہوتا ہے

سر جھکے اور کوئی اخلاص نہ ہو سجدے میں
تو خدا کو بھی مناجات سے دکھ ہوتا ہے

راس آتی نہیں خوشیوں کی یہ رِم جھم رِم جھم
چھت ٹپکتی ہو تو برسات سے دکھ ہوتا ہے

بھر گیا ہے مری آنکھوں میں اندھیرا کتنا
جگمگاتی ہوئی ہر رات سے دکھ ہوتا ہے
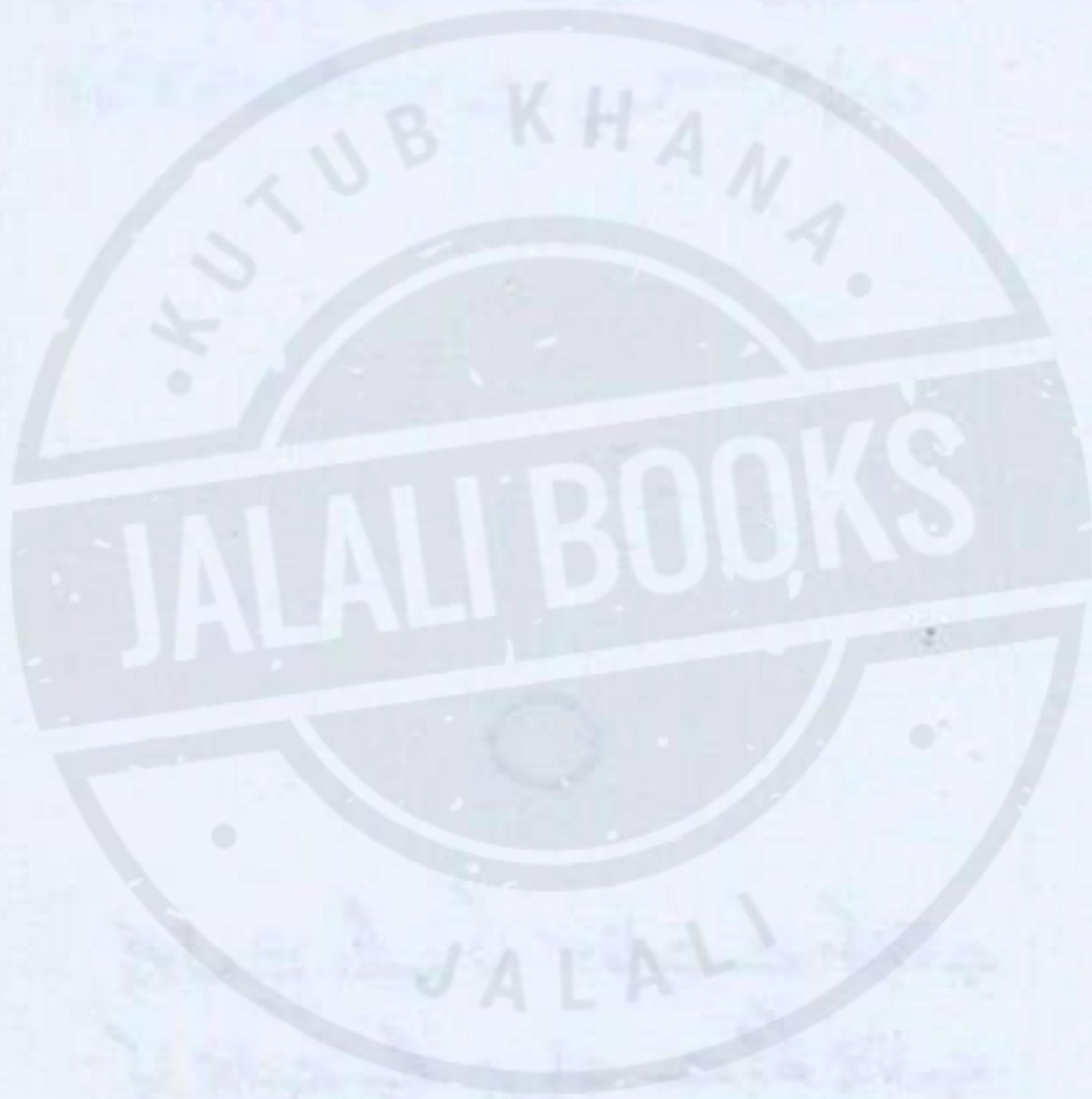
معجزہ ہے مری آرام طلب آنکھوں کا
خواب میں بھی تری تصویر بناتے رہنا

سفر طویل نہ تھا ساز و رخت کیا کرتے
وہ دے بھی دیتا اگر تاج و تخت کیا کرتے

بس اک چراغ تھا اس سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے
ہوا کا سامنا ہم تیرہ بخت کیا کرتے

پناہ لینی پڑی اپنی چھاؤں میں آخر
ہرا بھرا نہ تھا کوئی درخت کیا کرتے

ہر ایک وار کا چپ رہ کے ہی دفاع کیا
کٹی زبان تھی لہجہ کرخت کیا کرتے

کمی تو خوشنما رنگوں کی اس کے پاس نہ تھی
مگر سیاہ تھا اپنا ہی بخت کیا کرتے
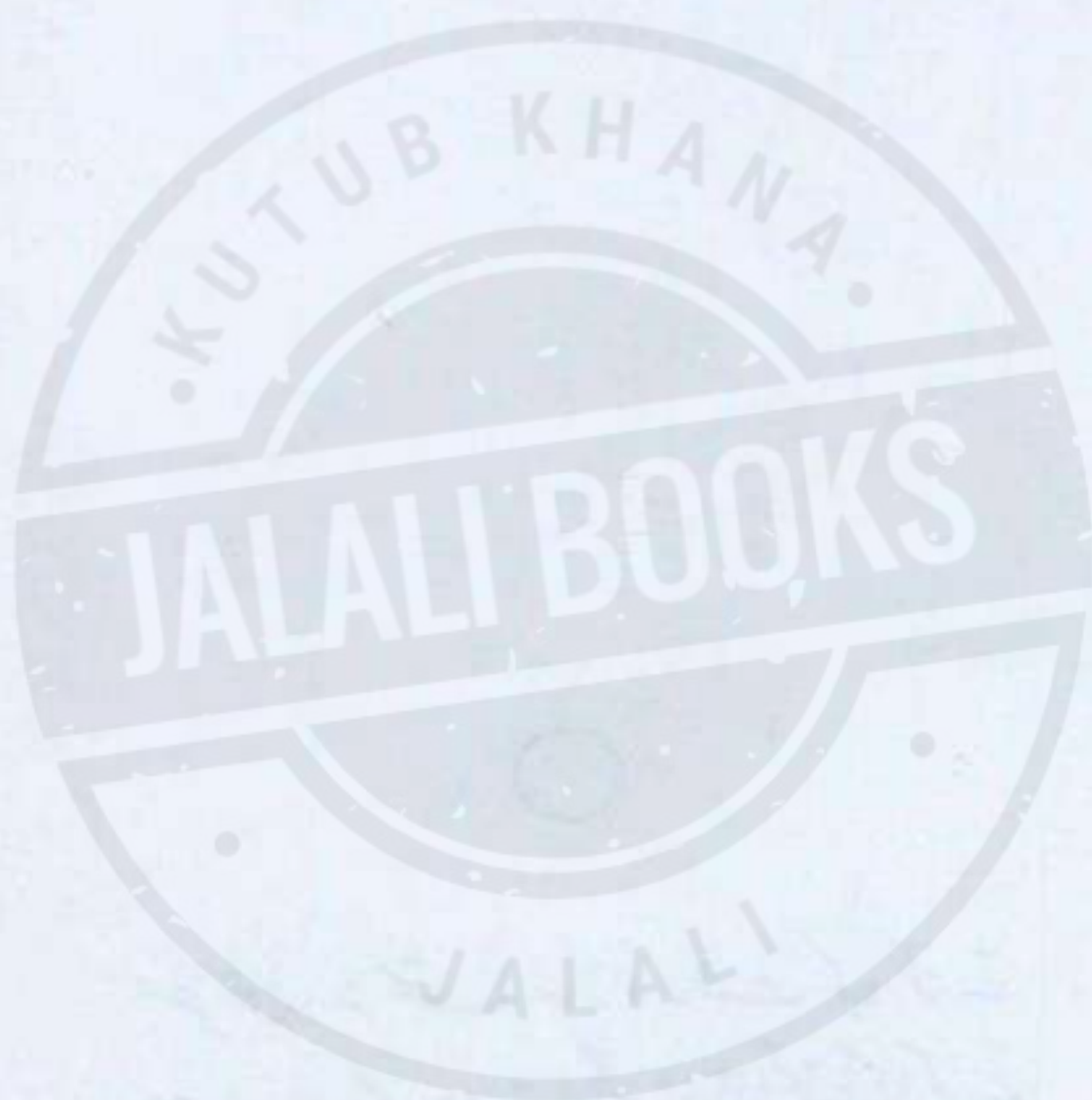
خوبصورت چھاؤں اس کی جانے کس آنگن میں ہو
پیڑ تھا گلمہر کا جو اپنے گھر کے سامنے

○
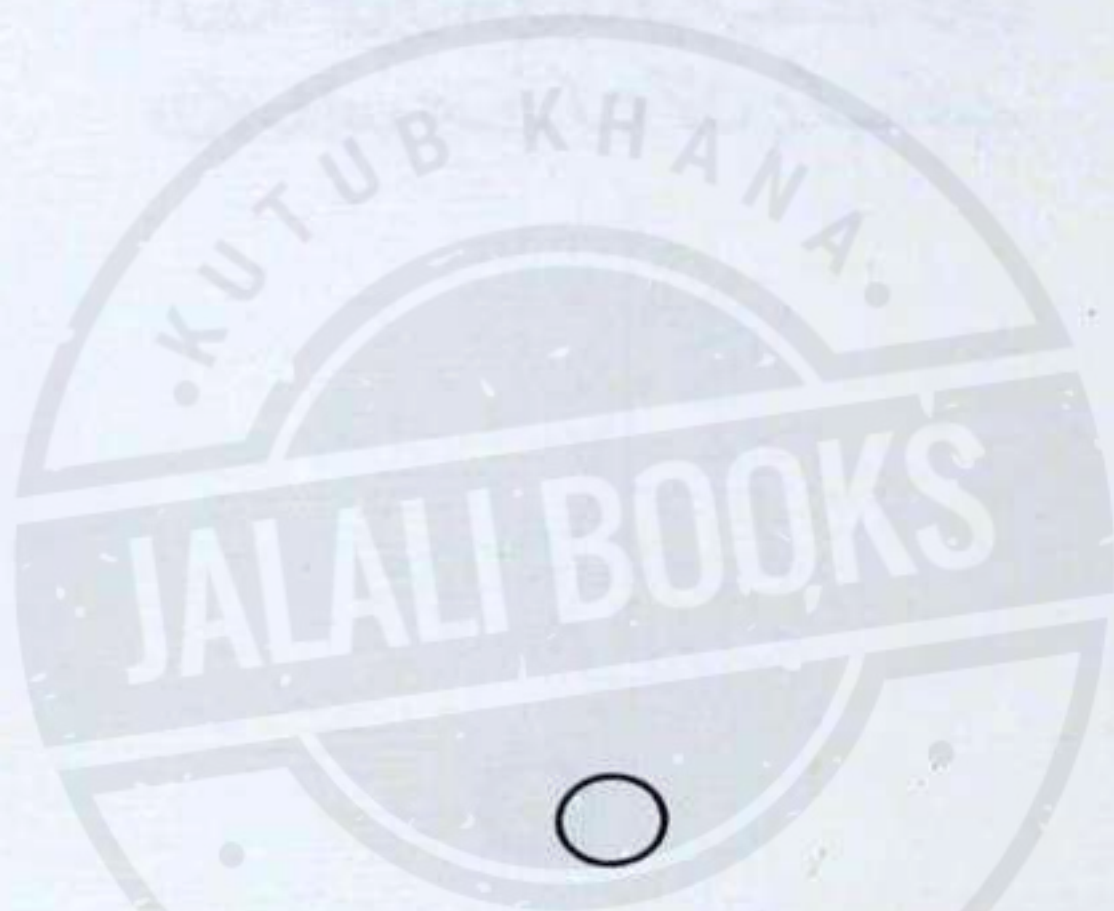
لاکھ کوئی چیخے چلّائے شور اندر کب آتا ہے
یوں بھی بستی کے نقشے میں میرا گھر کب آتا ہے

جانے کب سے جاگ رہے ہیں بس اتنا بتلا دو اب
جس کے خواب دکھاتے ہو تم وہ منظر کب آتا ہے

وہ تو یہی کہیں گے سارا جنگل بالکل چین سے ہے
ان کی شاخ پہ کوئی پرندہ خون میں تر کب آتا ہے

گمراہی پھیلانے والے روز اندھیرا لاتے ہیں
روز ہدایت دینے والا پیغمبر کب آتا ہے

جس کے قدموں کی برکت سے ہریالی تھی قصے ہیں
کیا بتلائے نانی ماں وہ جادوگر کب آتا ہے

اس کی آنکھیں پل دو پل ہی تو چہرے سے ہٹتی ہیں
دل کا سارا درد سمٹ کر ہونٹوں پر کب آتا ہے

○
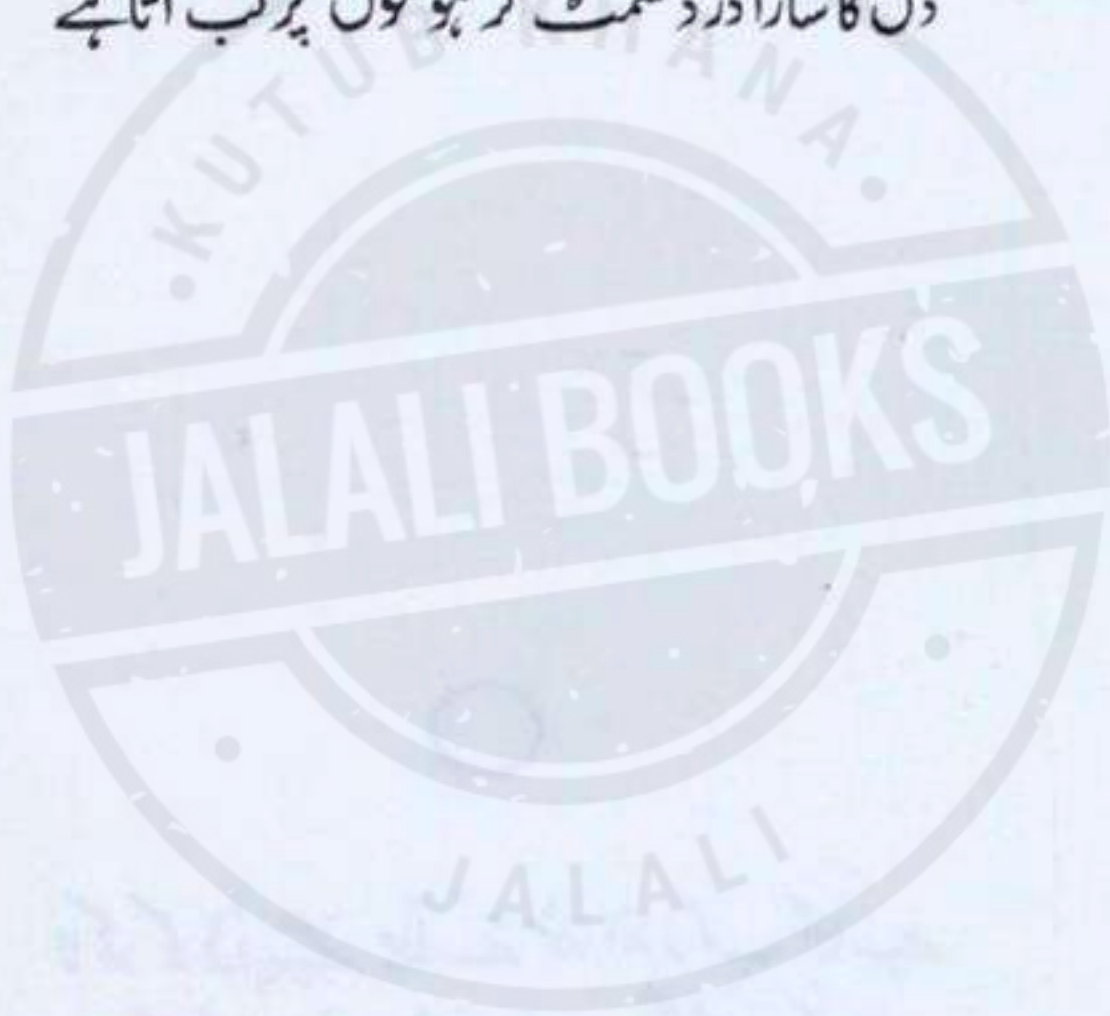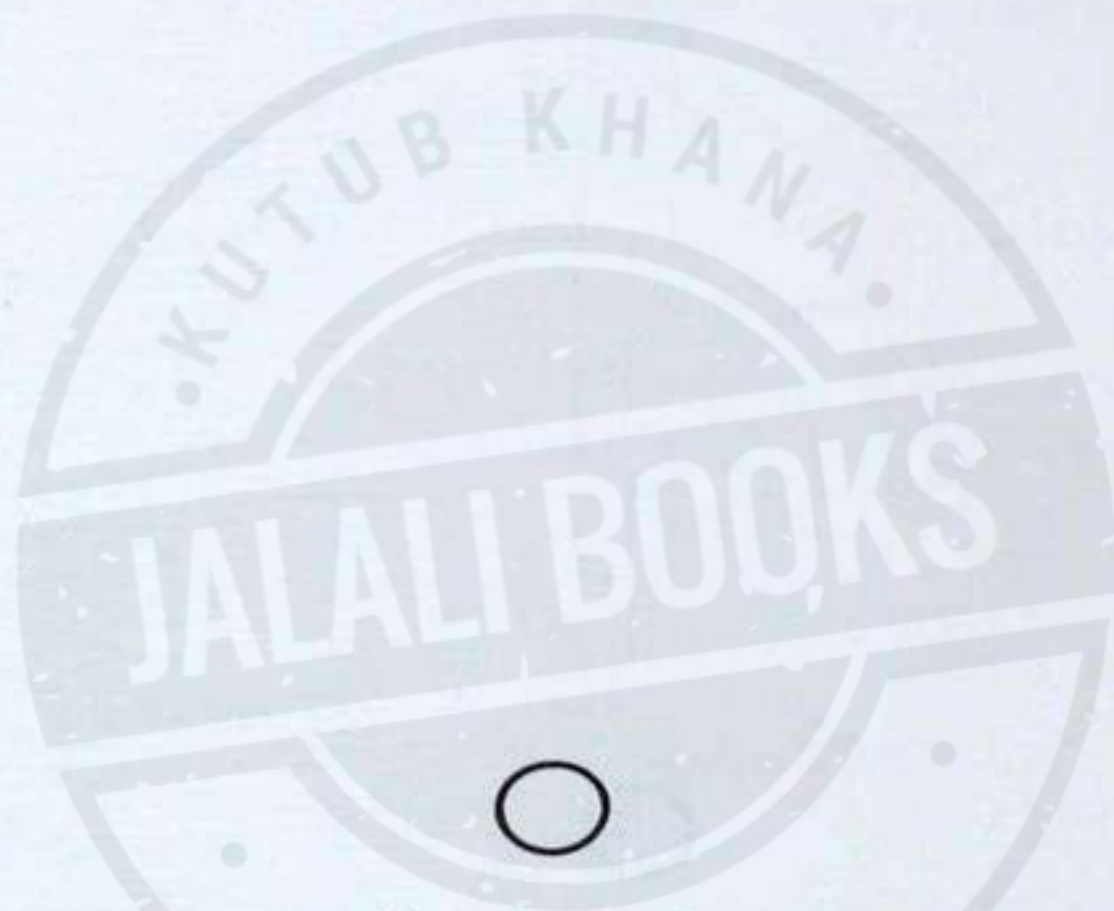
راستے بھر یہی سوچتے آئے ہیں
کیسے زندہ یہاں تک چلے آئے ہیں

آپ ہی چین کی نیند سونے نہ دیں
آپ ہی خواب بھی بیچتے آئے ہیں

ہم نے دیکھا ہے اِک جھوٹ کے سامنے
آئینے ہاتھ جوڑے ہوئے آئے ہیں

احمقوں کو یہ جنت پسند آ گئی
قید خانے گھروں میں چلے آئے ہیں

تیری روشن خیالی سے بھی کیا ملا
میرے حصّے میں بجھتے دیے آئے ہیں.
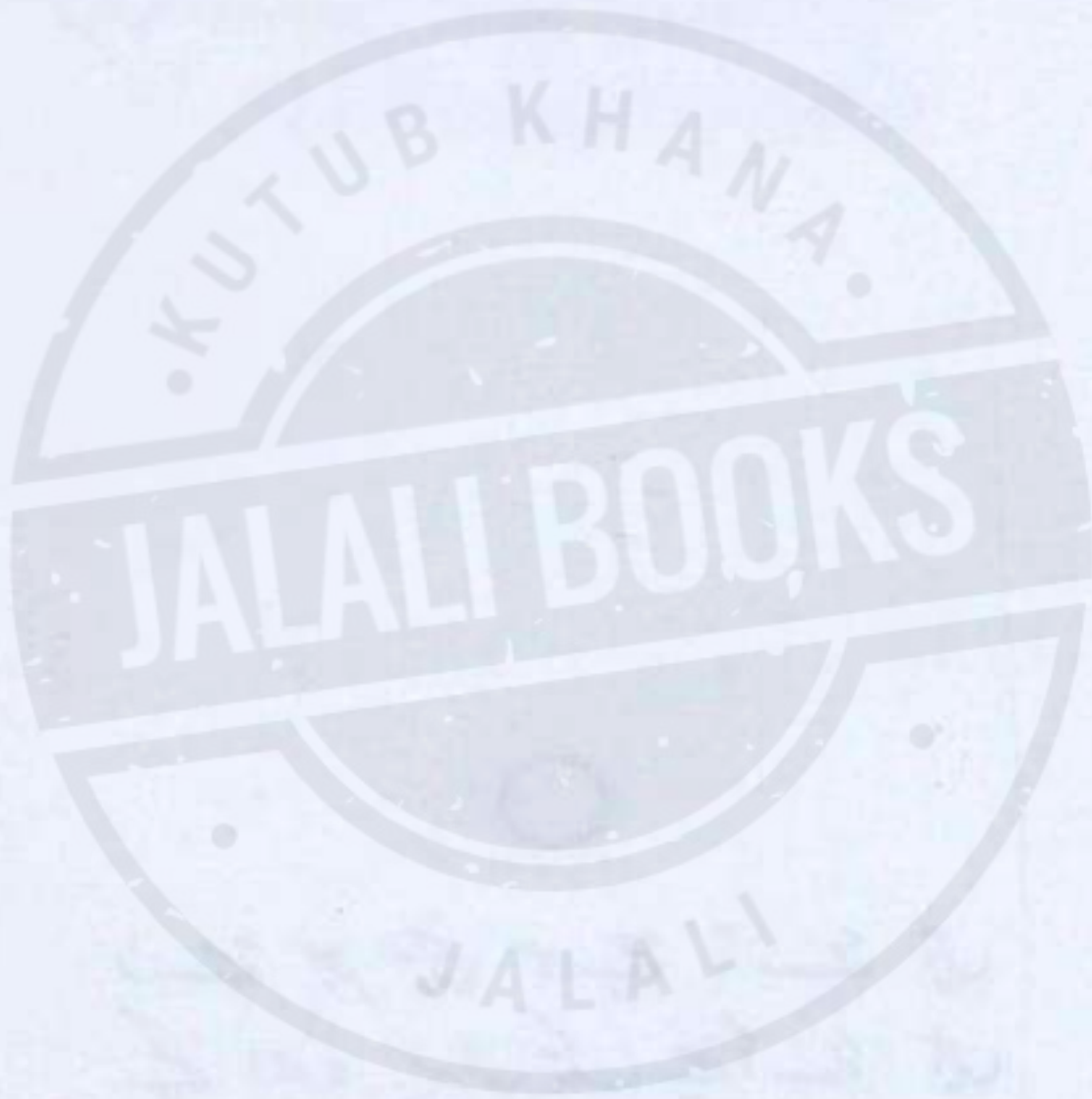
تیری تصویر کسی رنگ پہ راضی ہی نہیں
خون کہتا ہے کہ خاکے میں کمی کیوں رہ جائے

○
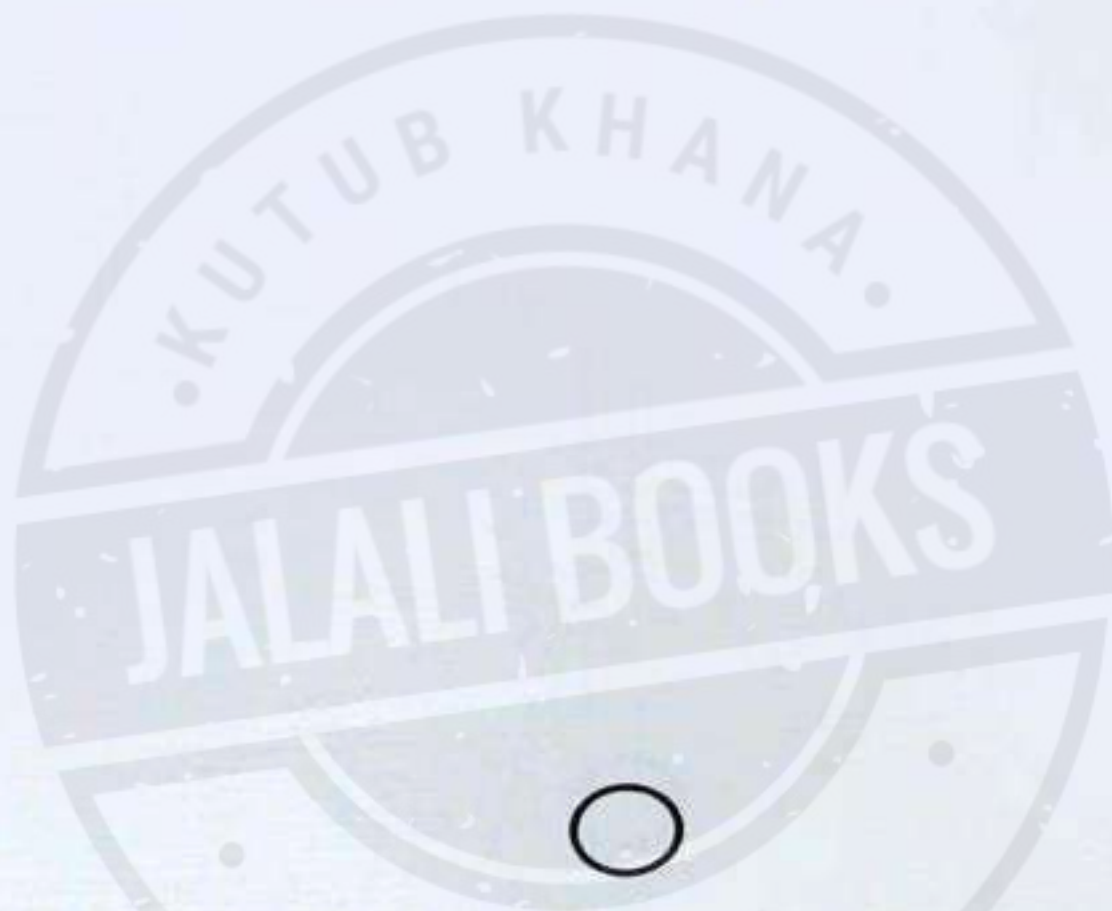
بھیڑ میں کھو ہی جاتے تو آتا مزہ
تم مجھے ڈھونڈھتے میں تمہیں ڈھونڈتا

زرد پتّے یہ بچّوں سے کہنے لگے
تتلیوں کے پکڑنے کا موسم گیا

وہ کہانی تری یاد کا عکس تھی
آج لکھتے ہوئے میں جسے رو پڑا

جھیل میں میری یادوں کی محفوظ ہے
عکس اب بھی وہ پہلی ملاقات کا

لوگ پڑھتے رہے لوگ لکھتے رہے
مر کے بھی میں کتابوں میں زندہ رہا

کس کی خوشبو ہواؤں کی ڈولی پہ تھی
دیر تک ہاتھ پتّوں کا ہلتا رہا

○
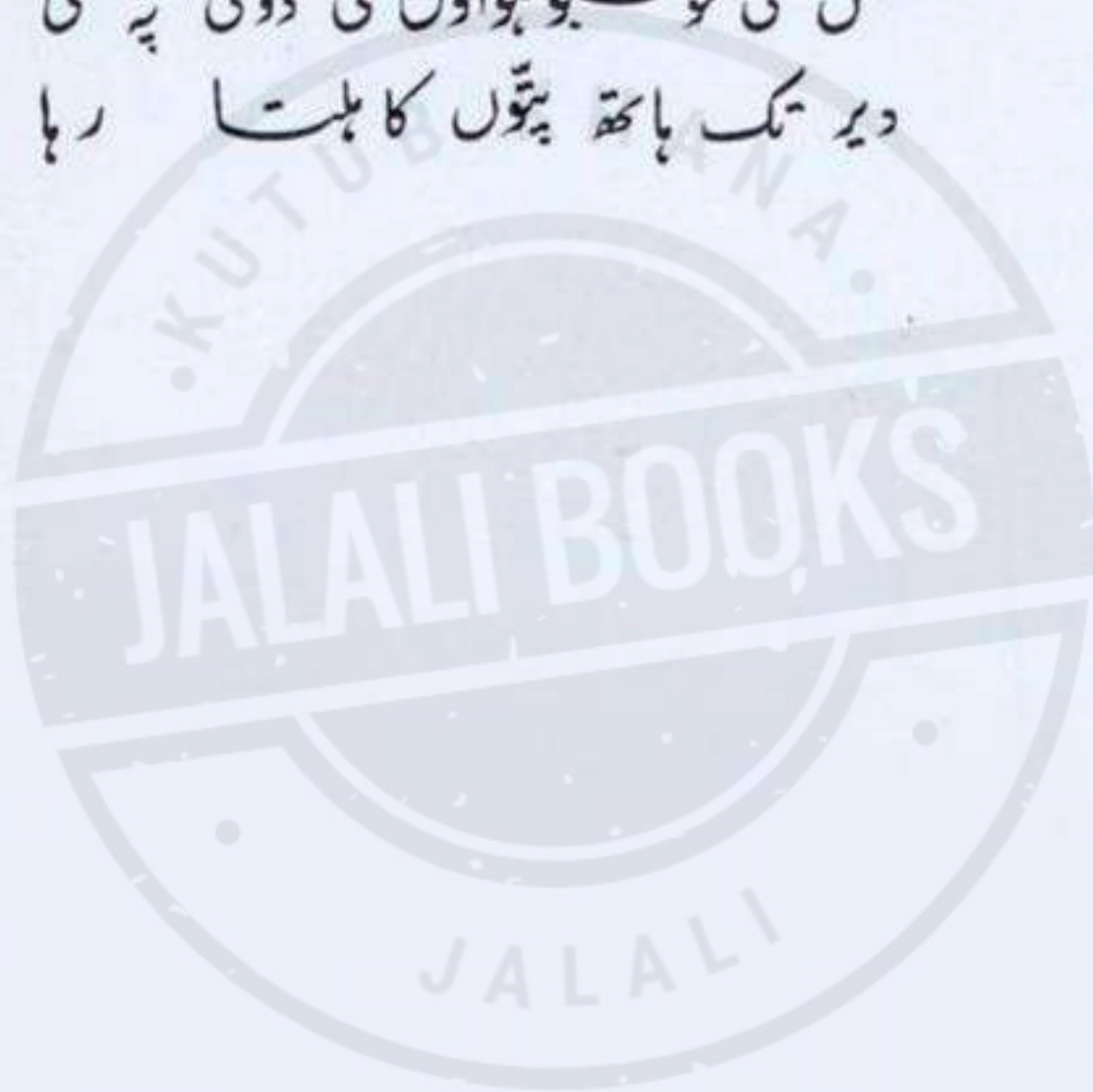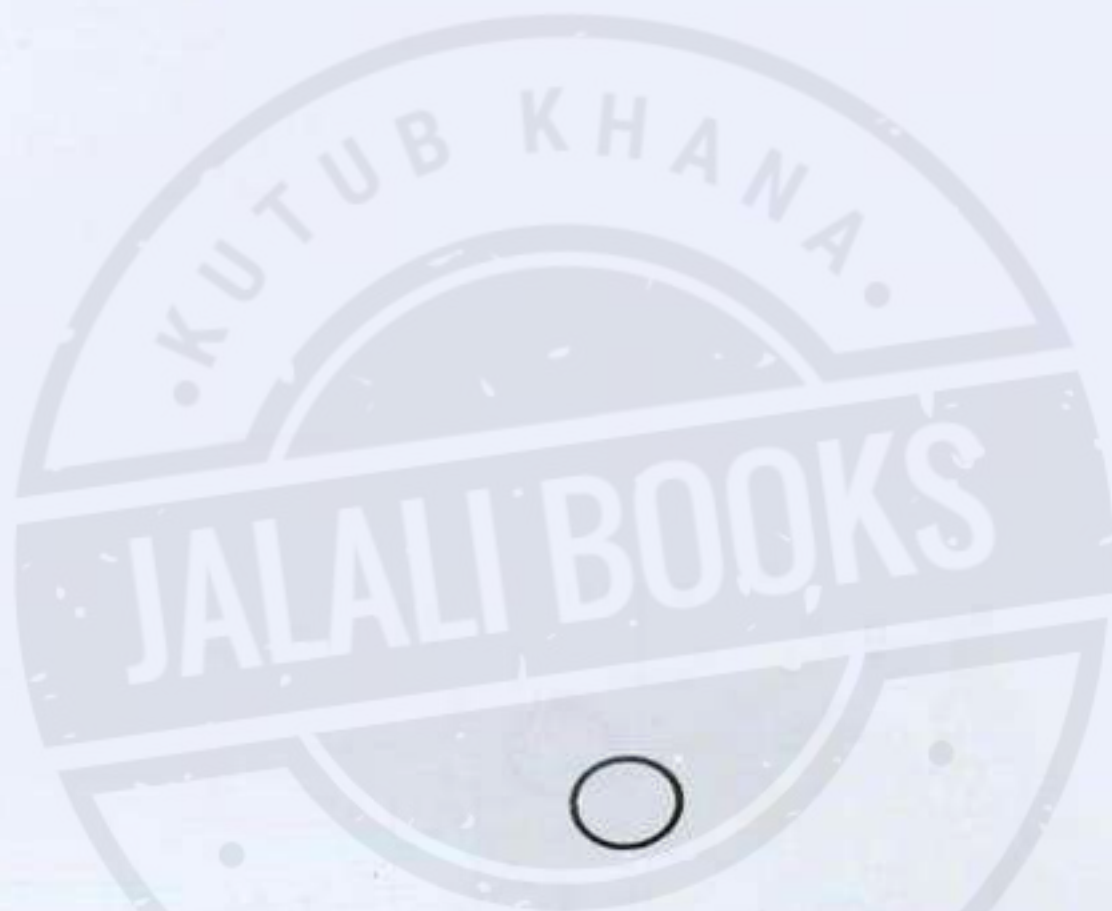
کیا کم ہے کرم اس کا ہم جیسے فقیروں پر
کچھ خواب کے جگنو ہیں پلکوں کے جزیروں پر

سوکھے ہوئے پتے ہیں مرجھائی ہوئی کلیاں
انعام کی بارش ہو موسم کے سفیروں پر

پھر کوئی بغاوت ہو پھر کوئی بساط اُلٹے
پھر چند پیادوں کی نظریں ہیں وزیروں پر

یہ آئینے گرد بھرے ان کی ہی عنایت ہیں
ہم جان لٹاتے تھے جن صاف ضمیروں پر

ہر گام تعاقب میں لشکر تھا سرابوں کا
ہر شخص کی آنکھیں تھیں پانی کے ذخیروں پر

راکھ ہونا ہی مقدر ہے تو چپ چاپ نہ جل
دل میں جو آگ ہے وہ آگ دبی کیوں رہ جائے

○
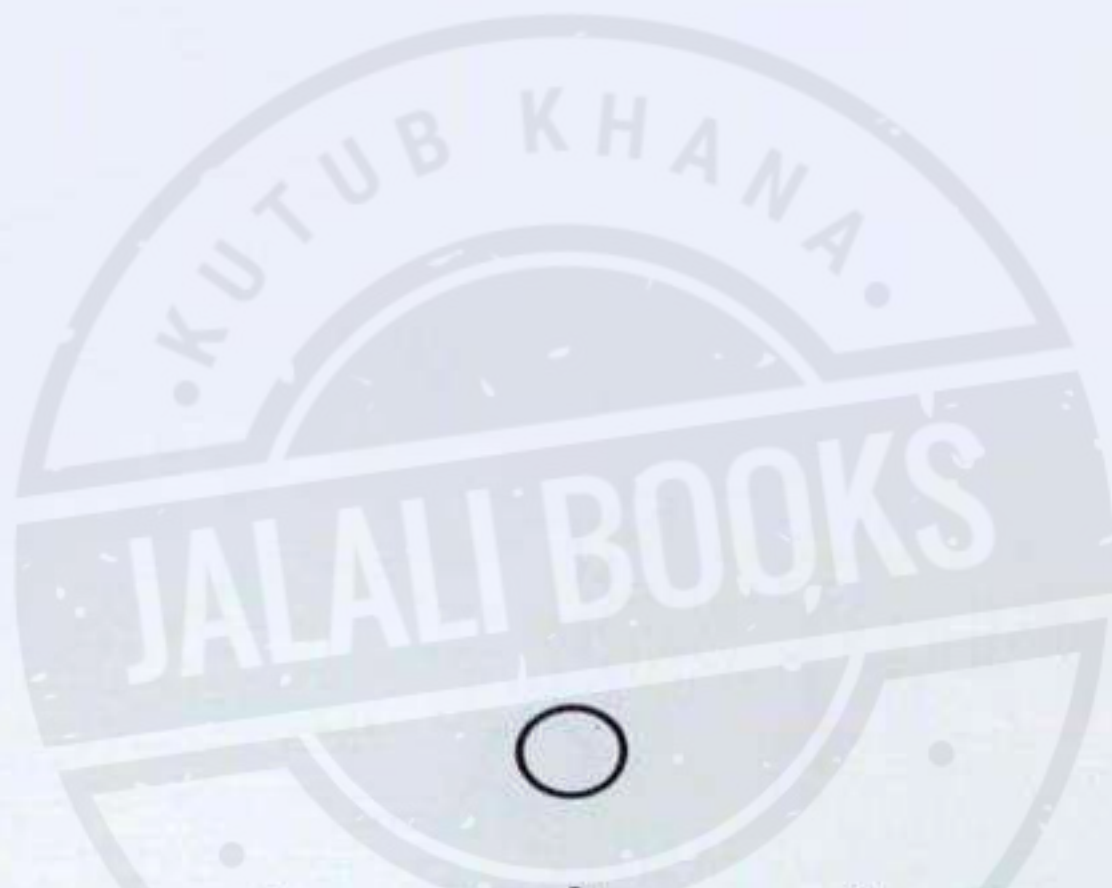
یہ سچ، کہ بات ہے اونچی مٹھاس ہو تو سہی
چٹان پر کہیں خوش رنگ گھاس ہو تو سہی

میں مٹھیوں میں ستارے لیے رہوں کب تک
لبوں پہ اُس کے کوئی التماس ہو تو سہی

دھرے رہیں گے سمندر کی ملکیت کے اصول
لہو سُلگ اٹھے ہونٹوں پہ پیاس ہو تو سہی

جسے بھلانے کو ہنستا ہنساتا رہتا ہوں
کبھی وہ میرے لیے بھی اُداس ہو تو سہی

میں کھڑکیوں کو کواڑوں کو کھول کر رکھوں
سنہری کرنوں کے جھونکے کی آس ہو تو سہی
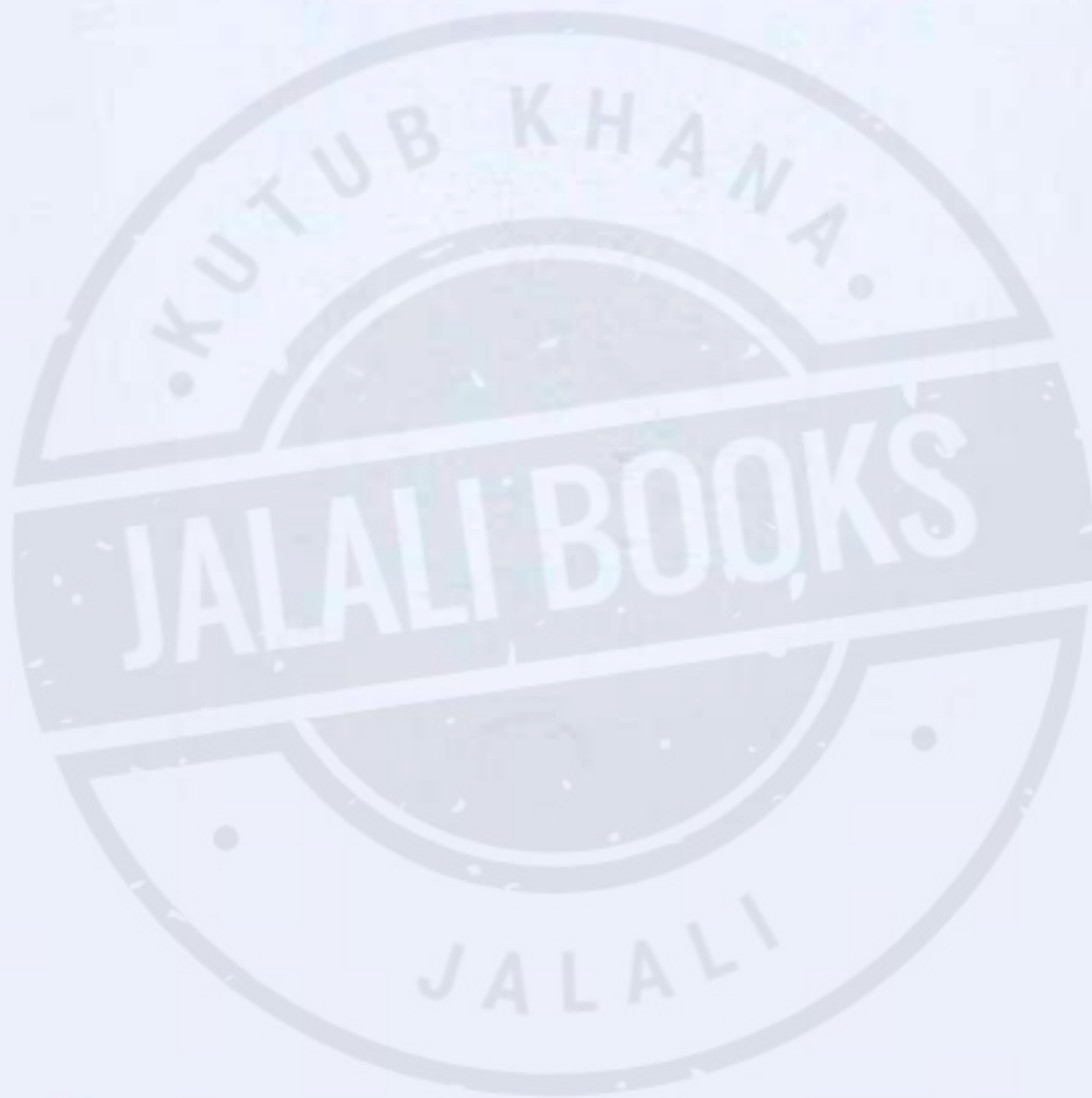
کیا ڈراتا ہم گنہگاروں کو دوزخ کا عذاب
زندہ رہنے کی اذیت کم نہ تھی اپنے لیے

عکس خوشیوں کے اُداسی کی امانت ہے کہاں
میرے چہرے پہ کوئی رنگ سلامت ہے کہاں

ڈوبنے والے کی ہر چیخ پہ مڑ کر دیکھے
بھاگتی لہر کو اس بات کی فرصت ہے کہاں

دستِ قابیل پہ بیعت کو بھی تیار ہیں ہم
خون میں پہلی سی وہ خوئے شہادت ہے کہاں

میری شاخوں پہ سویرا نہیں چہکا اب تک
کیا پتہ آج پرندے کی عنایت ہے کہاں

تم نے اس شہر کا نقشہ ہی بدل ڈالا ہے
میں کہاں جاؤں وہ بوسیدہ عمارت ہے کہاں

ایسی دنیا میں بھی جینے پہ مُصر ہیں ہم لوگ
اس جہنم میں بھی احساسِ اذیت ہے کہاں

○
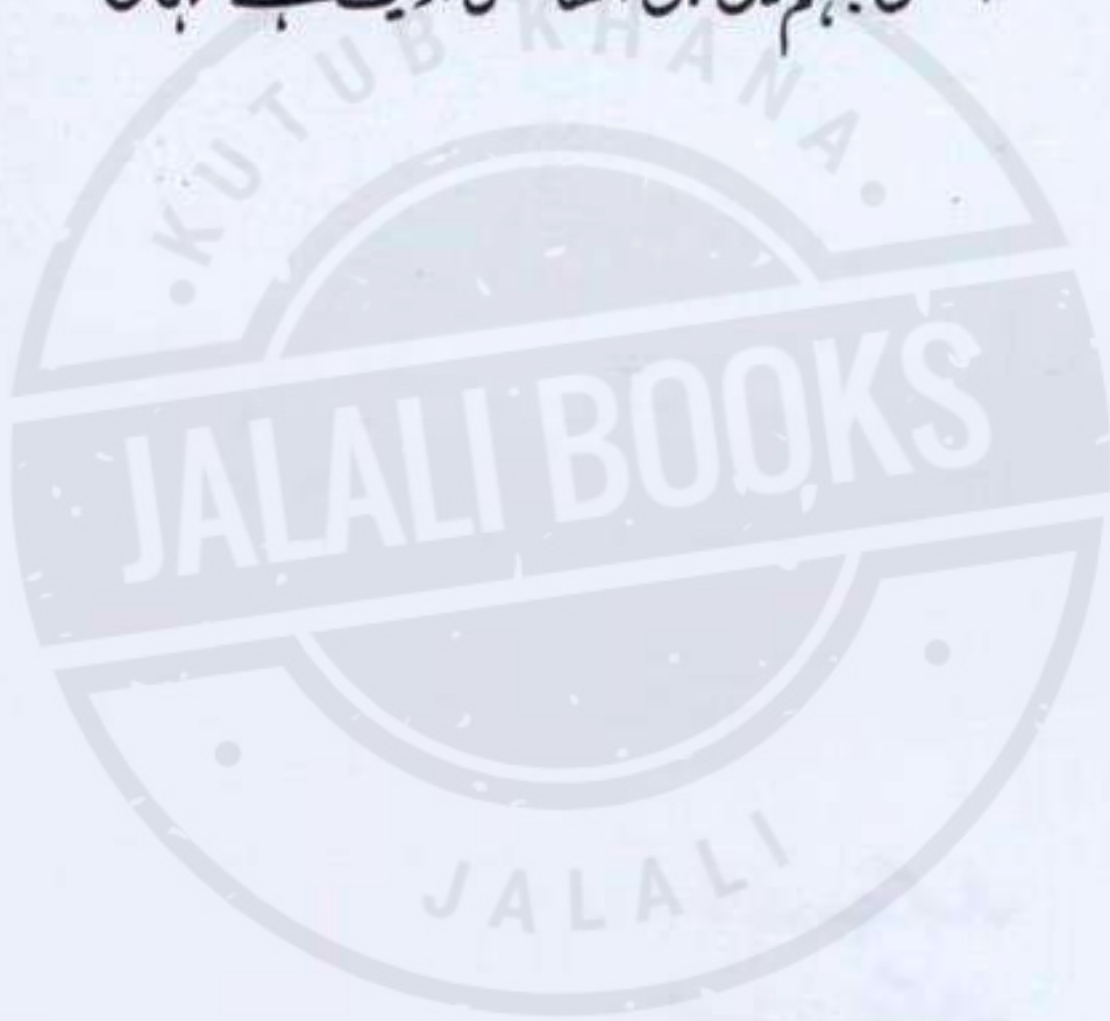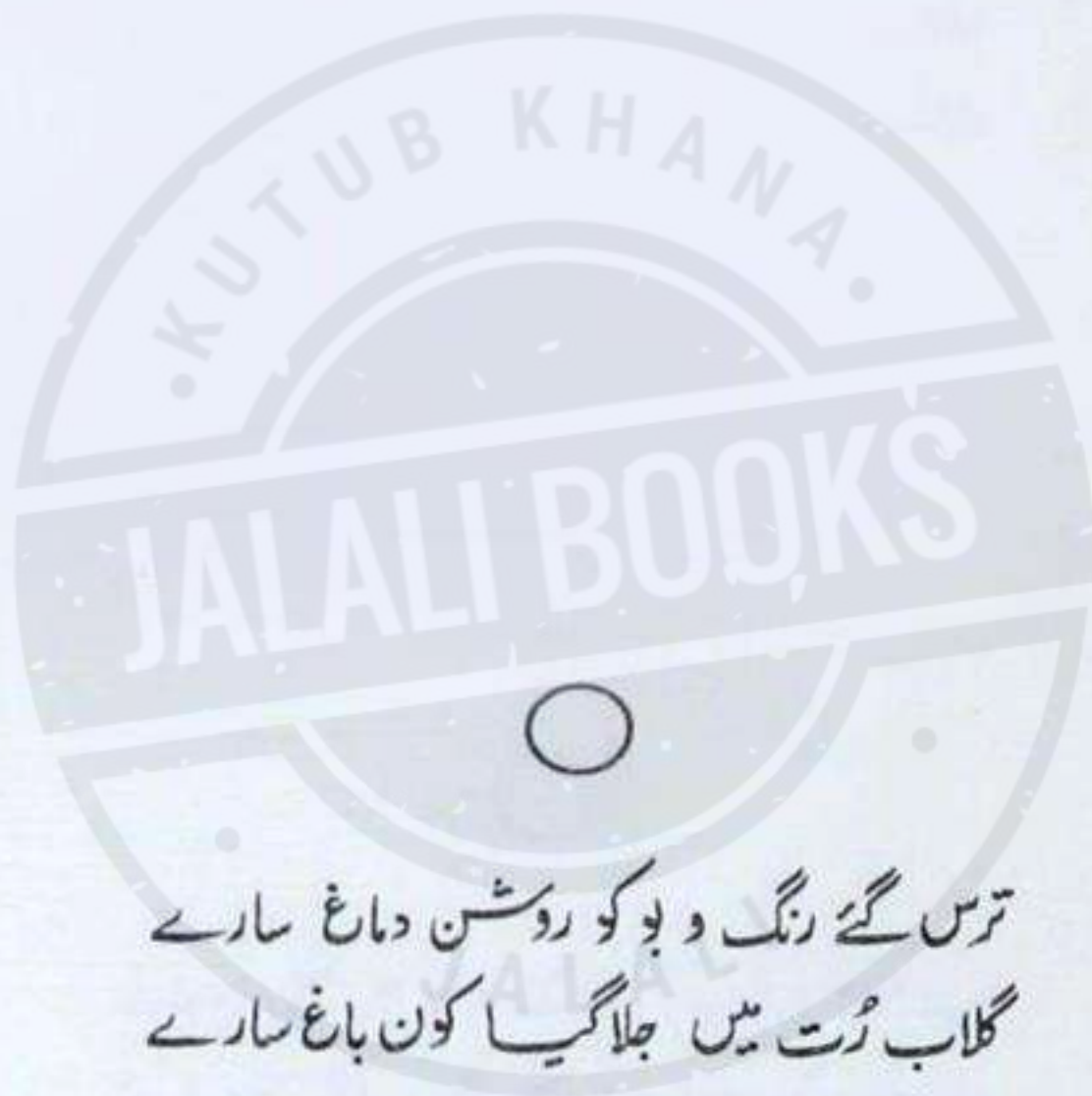
ترس گئے رنگ و بو کو روشن دماغ سارے
گلاب رُت میں جلا گیا کون باغ سارے

تمام جانب گھنا اندھیرا بکھر رہا ہے
مکاں کے اندر ہی جل رہے ہیں چراغ سارے

سفید کپڑوں کی لاج کچھ تو بچائی جائے
ہمارے جسموں پہ جڑ دیے جائیں داغ سارے

اماں ملی ہے یہ کیسے جنگل میں ہم کو یا رب
ہرے درختوں پہ بین کرتے ہیں زاغ سارے

سلگتے ہونٹوں کو مل رہی ہے سزائے ناحق
لرزتے ہاتھوں سے چھوٹتے ہیں ایاغ سارے

میں اپنی منزل کی سمت بڑھتا ہی جا رہا ہوں
عجب کہ آندھی میں جل رہے ہیں چراغ سارے

○
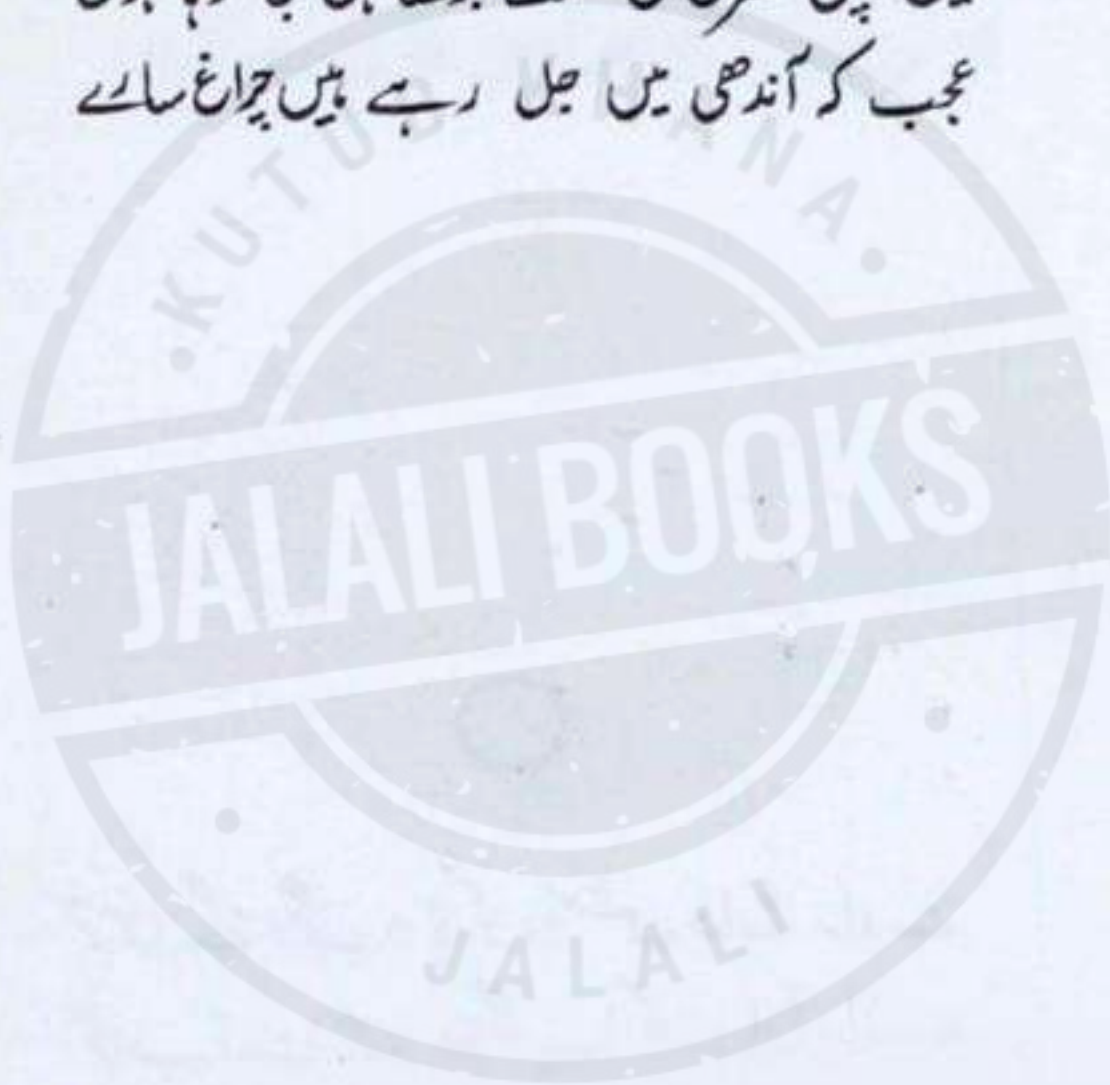
بے موسم کی بارش میں دنیا جل تھل ہو جائے
اپنا دکھ کہہ دوں تو پتھّر بھی پاگل ہو جائے

دنیا کو اوقات مہذّب لوگوں کی معلوم
ایک درندہ جب چاہے بستی جنگل ہو جائے

میری رگوں میں پھیل رہا ہے محرومی کا زہر
جس دریا پر جان لٹاؤں وہ بادل ہو جائے

دھوپ کے شر سے بچنے کی تدبیر بھی ہے کیا خوب
سورج سے امید یہ رکھتے ہیں بادل ہو جائے

اپنے لیے تو ایک سے ہیں سب خطے دنیا کے
جس دھرتی پر پاؤں رکھیں ہم وہ دلدل ہو جائے

ہر نئے لمحے کی آہٹ پہ لرز اٹھتے ہیں
کیا کریں ساعتِ خوش رنگ پہ مرنے والے

○

ڈوب جاؤں شام سے پہلے شفق ہو جاؤں میں
کیوں نہ ایسا ہو اچانک بے رمق ہو جاؤں میں

اپنے اندر کے جہاں کی سیر کرنی چاہیے
معجزہ دکھلائے کوئی اور شق ہو جاؤں میں

تیری تحریروں سے روشن ہے مرے دل کی بیاض
تو اگر چاہے تو پھر سادہ ورق ہو جاؤں میں

ایک جلتی شاخ پر ہوں خشک پتّے کی طرح
اور ہوا کہتی ہے اس کا ہم سبق ہو جاؤں میں

○

آنے والی رُت تو سہانی ہو سکتی ہے
خون میں ڈوبے ہاتھ نہیں دھو سکتی ہے

البم دیکھ کے اتنا خوش کیوں ہوتا ہوں
کل تیری تصویر بھی تو کھو سکتی ہے

آدھی رات، پرایا شہر، اور سنّاٹا
یہ دستک آخر کس کی ہو سکتی ہے

جنگل کو اس خوش فہمی نے راکھ کیا
شبنم کی بوند آگ نہیں بو سکتی ہے

○
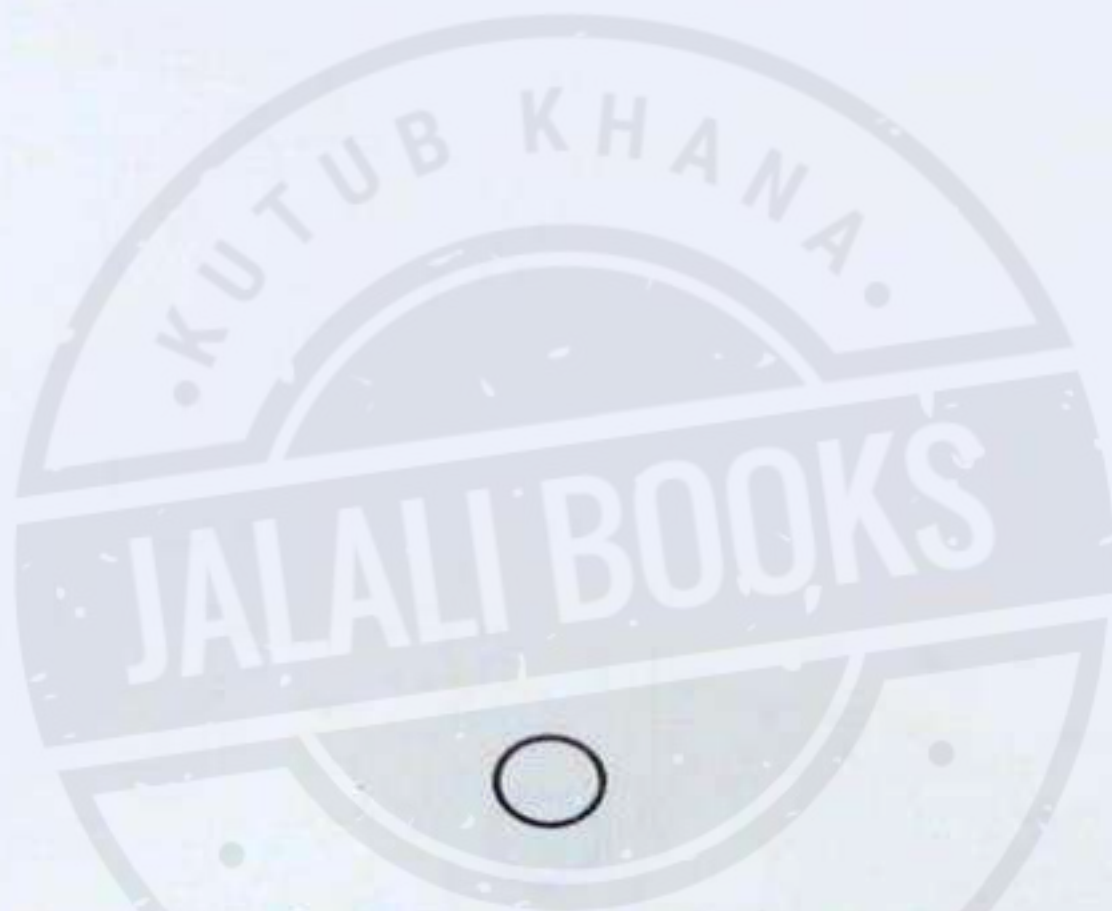
لٹائے اس نے خزانے تو یاد بھی نہ رہے
ہمارے ہاتھ کے کاسے تو یاد بھی نہ رہے

ملے تو یوں کہ خدائی تمام عالم کی
وہ لوگ کیا تھے کہ بچھڑے تو یاد بھی نہ رہے

میں انتقام لوں کس کس کے خون کا آخر
بہت سے لوگوں کے چہرے تو یاد بھی نہ رہے

پھر اس کے بعد ملی اتنی درد کی دولت
تری جدائی کے صدمے تو یاد بھی نہ رہے

کہاں سے آنے لگیں چیخنے کی آوازیں
اب اس مکان کے ملبے تو یاد بھی نہ رہے

میں نے ہی رنگ روپ دیا ہے اسے مگر
تصویر بولتی ہے کسی اور کے لیے
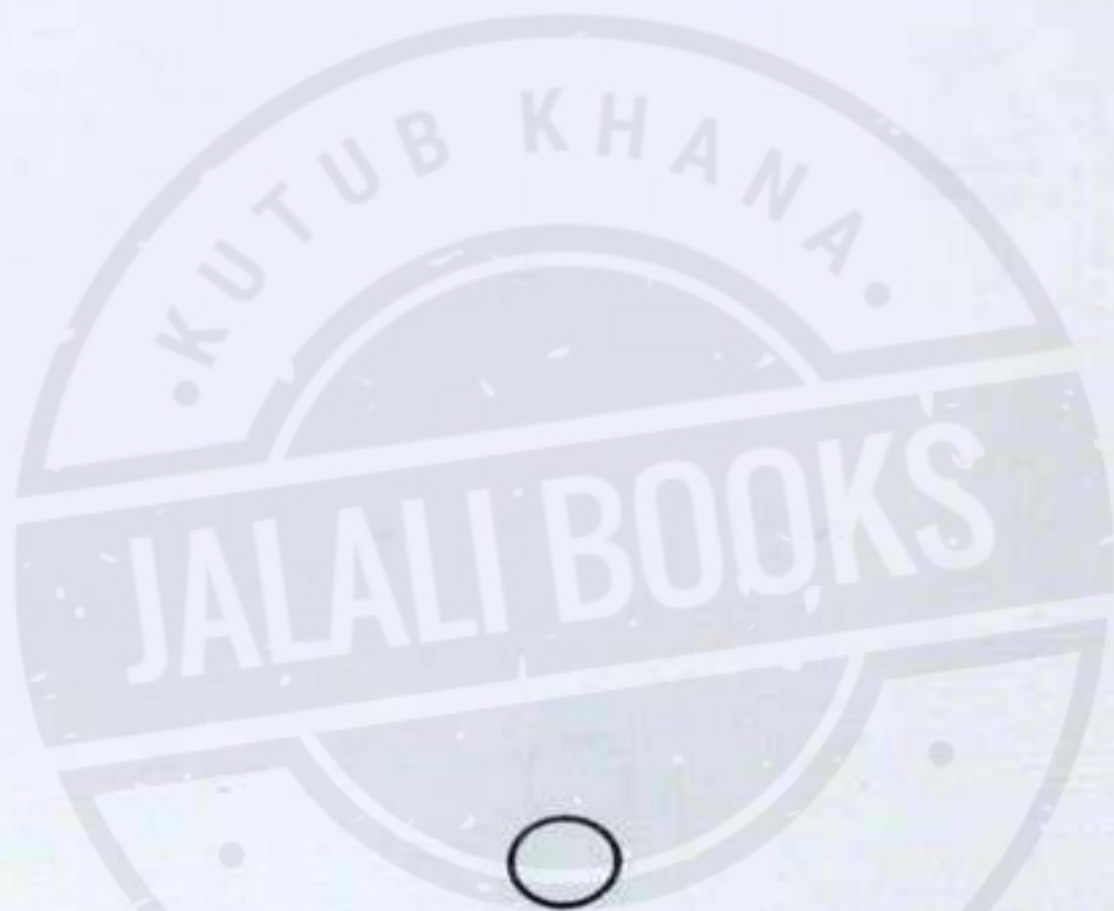
لاکھ غم ہوں پر خوشی جیسا بھی کچھ باقی رہے
سانس ہے تو زندگی جیسا بھی کچھ باقی رہے

خونِ ناحق کیجیے اور پھر عطا کیجیے قصاص
یوں کہ بندہ پروری جیسا بھی کچھ باقی رہے

بس دھوئیں سے ہی اگر بھر جائیں گھر آنگن تو کیا
روشنی میں روشنی جیسا بھی کچھ باقی رہے

اس زمیں کی خاک قاتل ہے فرشتوں کے لیے
نیک لوگوں میں بدی جیسا بھی کچھ باقی رہے

ایک ہی ماحول سے اکتا نہ جائے آدمی
شور بھی ہو خامشی جیسا بھی کچھ باقی رہے

ہم کو آزادی ملے گی شرط بس اتنی سی ہے
سر اُٹھے تو بندگی جیسا بھی کچھ باقی رہے

○

خونِ ناحق ہو چکا تلوار پانی ہو چکی
بندہ پرور آپ سے تو حکمرانی ہو چکی

ظلمتوں کی مملکت میں کون چھیڑے گا جہاد
اب خدا کی حیثیت بھی داستانی ہو چکی

سانس بھی کوئی نہ لے تیری اجازت کے بغیر
جبر کا عالم ہے یہ تو زندگانی ہو چکی

خواب، خوشبو، یا ستارہ کچھ نہ تھا جو آدمی
اس کے بارے میں بھی کیا کیا خوش گمانی ہو چکی

یہ عنایت ہے اگر تو اب خدا کے واسطے
ظلم ہی کیجے کہ ہم پر مہربانی ہو چکی

اوس کے قطروں نے جا کر کہہ دیا آنکھوں کا حال
گفتگو ان سے ستاروں کی زبانی ہو چکی

O
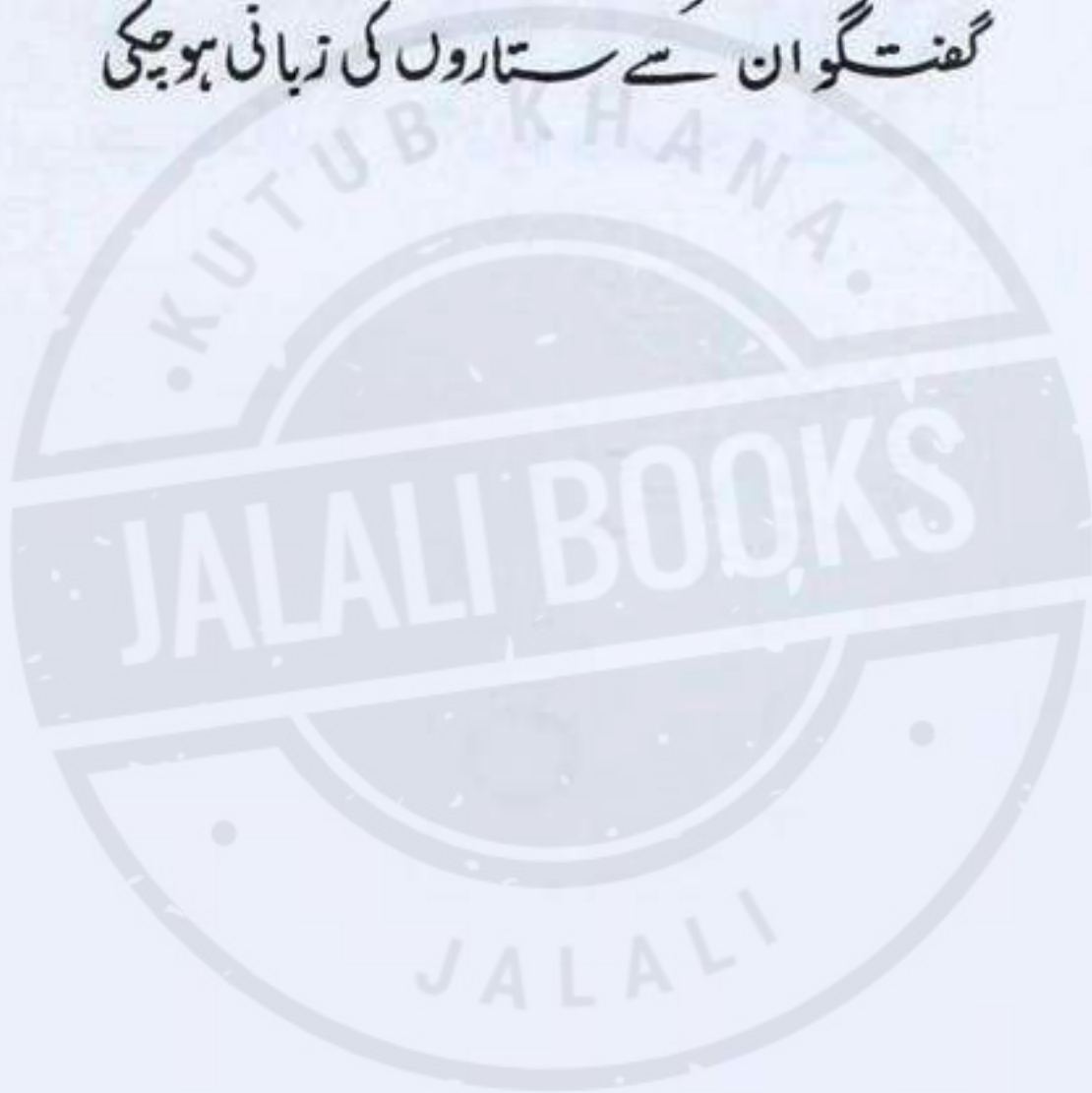
موسم کی اگر گاؤں سے رنجش نہیں ہوتی
کھیتوں میں فقط دھوپ کی بارش نہیں ہوتی

رحل میں ہاتھوں کی ہو قرآن سا چہرہ
کچھ اس کے سوا پڑھنے کی خواہش نہیں ہوتی

بچوں کو مرے شوق ہے تتلی کے پروں کا
اور شہر میں پھولوں کی نمائش نہیں ہوتی

برسات کے موسم میں کوئی روٹھ گیا تھا
اس دن سے مرے گھر کبھی بارش نہیں ہوتی

تم تھے تو یہی شہر عجب شہر تھا، لیکن
اب گھر سے نکلنے کی بھی خواہش نہیں ہوتی

آس کا پنچھی دور نکلتا جاتا ہے
شام کے سائے دیواروں پر گرتے ہیں

○
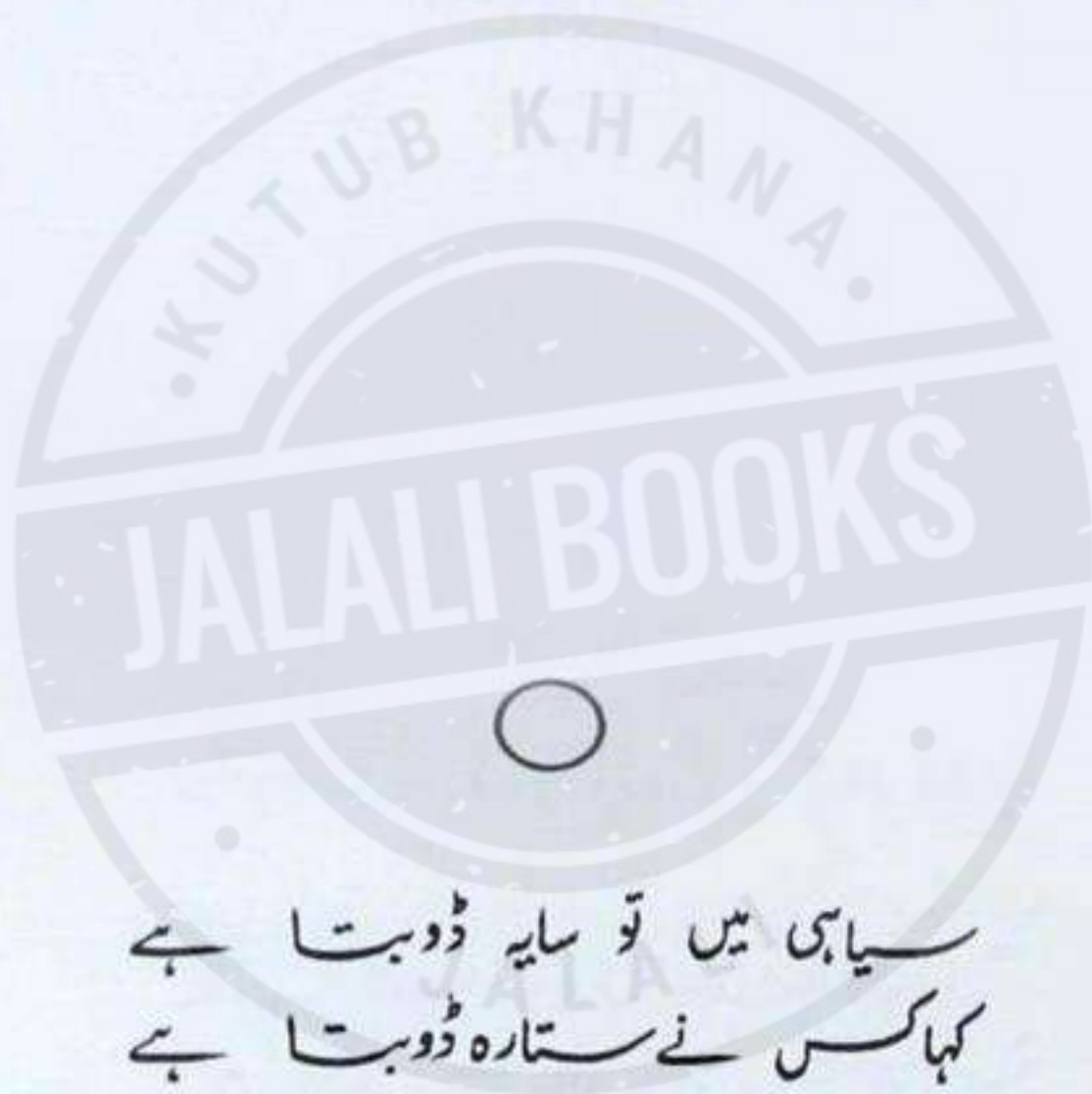
سیاہی میں تو سایہ ڈوبتا ہے
کہا کس نے ستارہ ڈوبتا ہے

زمانے سے الگ اک چاند دیکھا
خیالوں میں اُبھرتا ڈوبتا ہے

یہ سارے پھول دریا میں گرا دو
نہیں تو اب شکارا ڈوبتا ہے

یہ کہہ کر خود کو سمجھاتا رہا ہوں
کہ سورج بھی تو تنہا ڈوبتا ہے

چلا آتا ہے میناروں پہ پانی
ابابیلو! بسیرا ڈوبتا ہے
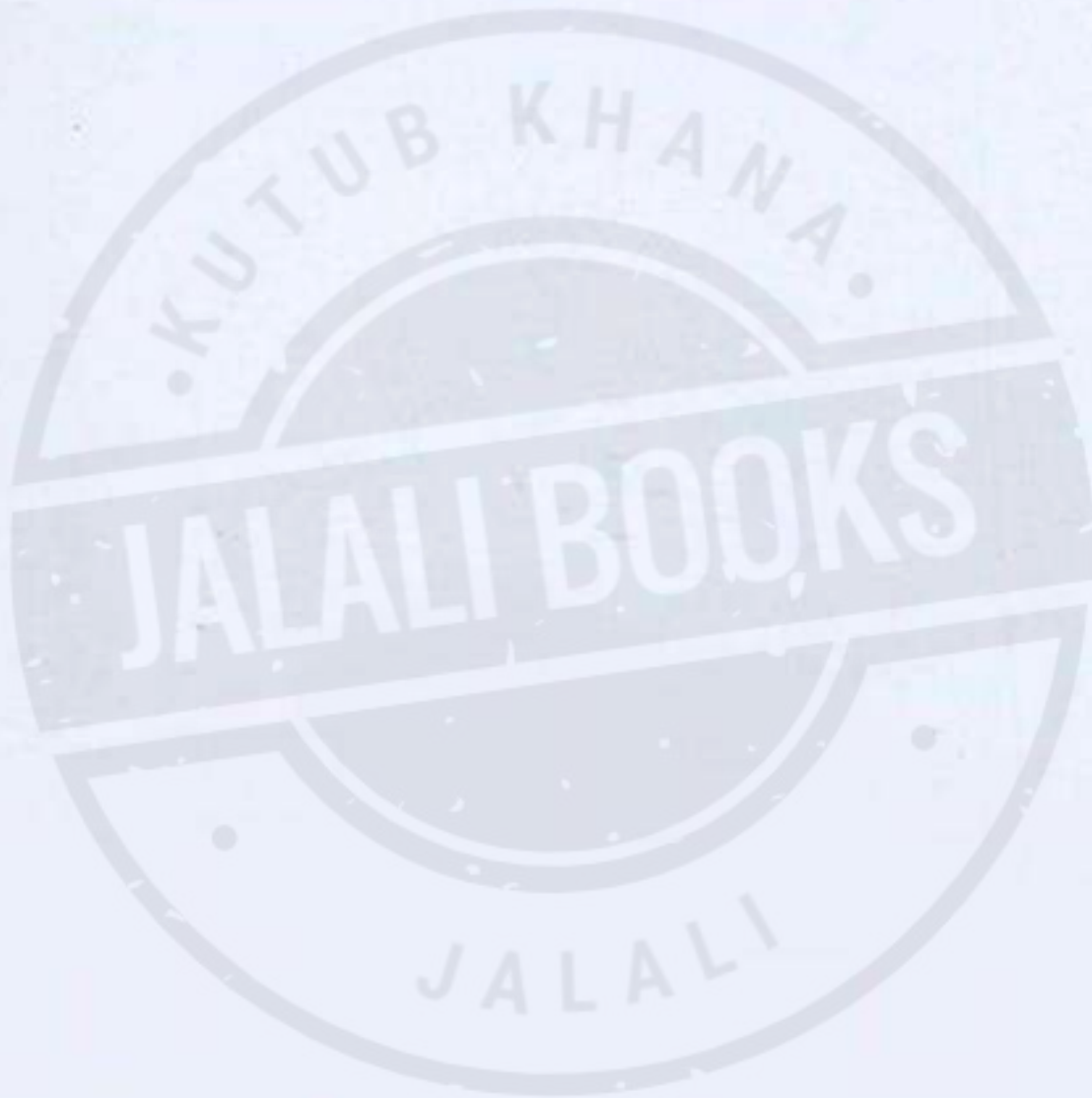
تیرے ملنے کا نشہ ٹوٹ گیا آخر کیوں
تیرے جانے کا ہے صدمہ وہی پہلے جیسا

○
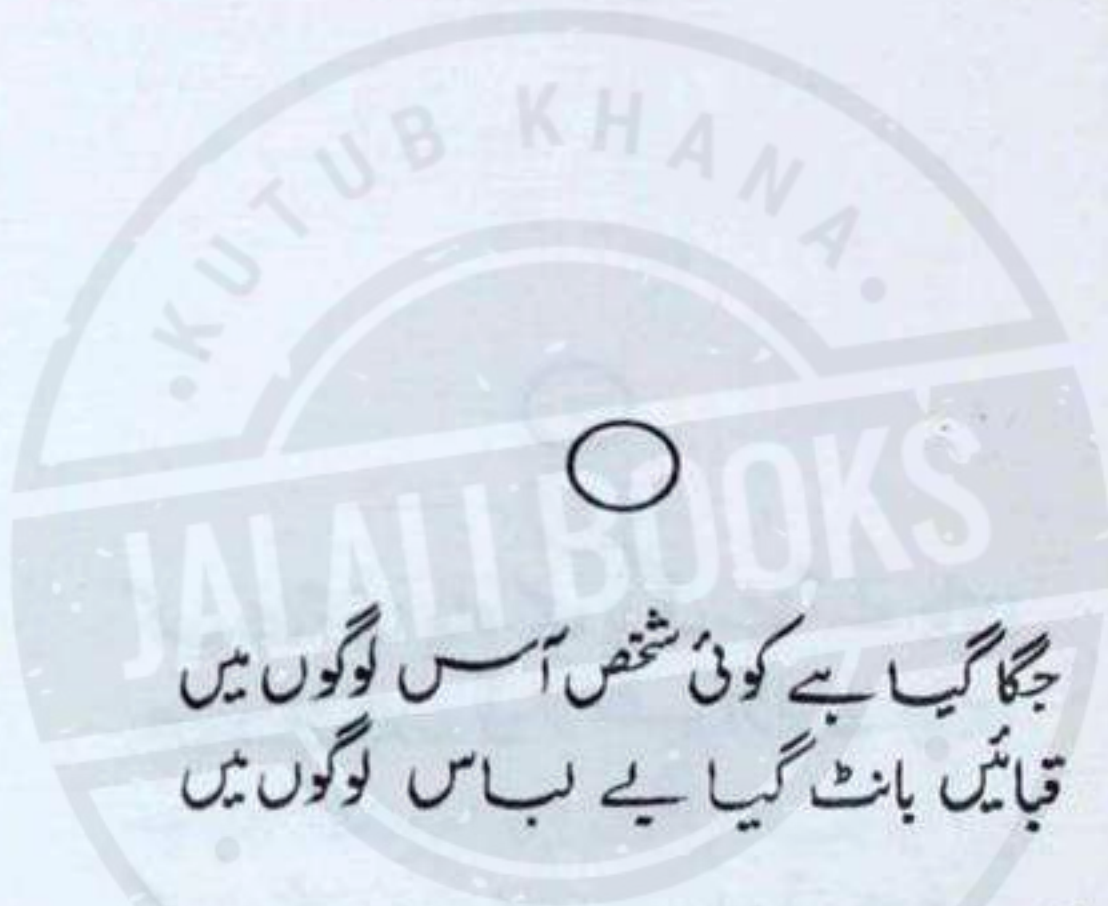
جگا گیا ہے کوئی شخص آس لوگوں میں
قبائیں بانٹ گیا بے لباس لوگوں میں

کسی اجاڑ کھنڈر میں دیا جلا جا کر
سکوں تلاش نہ کر بدحواس لوگوں میں

ذرا سی روشنی میرے بھی گھر میں کیا پہنچی
ہے کھلبلی سی عجب آس پاس لوگوں میں

سب اپنے خون سے ہی تر کریں گے ہونٹوں کو
وہ بانٹ جائے گا خالی گلاس لوگوں میں

○

کب سے تیری چاہ میں پاگل ہے، آلے جا ہوا
اس دمکتے پھول کی خوشبو اُڑا لے جا ہوا

کیوں الجھتی پھر رہی ہے ہر لرزتی شاخ سے
ہو سکے تو زرد پتوں کی دُعا لے جا ہوا

خوشنما رنگوں سے اتنی دوستی اچھی نہیں
ننھّے ہاتھوں سے غبُاروں کو اڑا لے جا ہوا

میری نادانی پہ ہنستا ہے سیہ پوشوں کا شہر
آ، مرے تن سے بھی یہ اجلی قبا لے جا ہوا

○

بندہ پرور آپ جو فرمائیے منظور سب
میرا کیا جب سرنگوں ہیں سرمد و منصور سب

ہے کوئی جو ڈوبتے سورج کی دلداری کرے
میں فروزاں تھا تو لینے آرہے تھے نور سب

یہ گناہوں کی تجارت کا نشہ بھی ہے عجیب
سب خسارے میں ہیں لیکن ہیں بڑے مسرور سب

خواہ دیوالی ہو تیرے شہر میں یا شب برات
حق پرستوں کے لیے تو ہے شب عاشور سب

○

اپنے ہونے کا کوئی سراغ تو ملے
دل نہیں رہا مگر دماغ تو ملے

روشنی ہی روشنی ملے گی ہر طرف
آندھیوں کے ہاتھ میں چراغ تو ملے

ایک بوند ہے مگر بدن میں خوں تو ہے
خالی ہی سہی مگر ایاغ تو ملے

چاہے جس طرح بھی ٹوٹے دشت کا سکوت
اور کچھ نہیں صدائے زاغ تو ملے

○

تعجب ہے کبھی رشتہ نہ ٹوٹا
شجر اُکھڑے مگر پتّہ نہ ٹوٹا

خوشی کی رُت صدائیں دے رہی تھی
مگر اک درد سے رشتہ نہ ٹوٹا

اسے کہتے ہیں شاید وضع داری
ہتھیلی کٹ گئی شیشہ نہ ٹوٹا

ہمارے ساتھ بھی مجبوریاں تھیں
مگر ہم سے کبھی وعدہ نہ ٹوٹا

○

کیا عجیب نظّارے، خواب کے نگر جیسے
سارے رنگ چمکیلے تتلیوں کے پر جیسے

یوں شکار کرتا ہے لوٹتے پرندوں کا
یاد ہی نہیں آتا اس کو اپنا گھر جیسے

کچھ عجب نہیں یہ بھی روشنی کی سازش ہو
چند سائے چلتے ہیں ساتھ ہم سفر جیسے

یہ تمہاری سرگوشی یا ہوا کی سرگم ہے
رات کے بیاباں سے گیت کا گزر جیسے

○

شاہ کو قصّے سنائے نہ قصیدہ لکھّا
شاعری کیا ہوئی اپنے لیے کتبہ لکھّا

ایسے قاتل سے کوئی مانگے تو کیا مانگے قصاص
اپنے ہر حکم کو کہتا ہے خدا کا لکھّا

مصلحت ساز زمانے کی شریعت معلوم!
اس نے جس شہر کو چاہا ہے مدینہ لکھّا

اپنی آنکھوں سے لگائے رکھیں کس کس کو ہم
ایک اک چیز پہ ہے نام تمہارا لکھّا

○

عزم بھی پختہ نہ تھا تلوار بھی مٹّی کی تھی
میں اگر ہارا تو میری ہار بھی مٹّی کی تھی

ایک ہی برسات نے سر کی فضیلت چھین لی
اب کھلا اس شخص کی دستار بھی مٹّی کی تھی

کھا گیا دریا کو آخر میری غرقابی کا غم
کیا پتہ اس کو مری پتوار بھی مٹّی کی تھی

اب کے بارش میں تو چٹانوں کے چہرے کٹ گئے
مجھ کو کیا غم ! میری تو دیوار بھی مٹّی کی تھی

O

بھولی باتیں چھوٹا سن
لوٹا دے بچپن کے دن

جانے والے لوٹ بھی آ
جی نہیں لگتا تیرے بن

یاد آیا پھر اپنا گاؤں
اونچی حویلی بوڑھا جن

پورا سال دسمبر ہے
لمبی راتیں چھوٹے دن

○

آفتاب تازہ کی تحریم باقی ہے ابھی
ظلمتوں میں صبح کی اقلیم باقی ہے ابھی

اس کے خاکے میں تو سارے رنگ میں نے بھر دیے
یاد کب تھا اپنی ہی تجسیم باقی ہے ابھی

خود غرض بستی میں کس کو ہے عقیدت پیڑ سے
یوں کہو کہ چھاؤں کی تعظیم باقی ہے ابھی

کون مجھ کو پڑھ رہا ہے صفحۂ قرطاس پر
میں تصوّر ہوں مری ترقیم باقی ہے ابھی
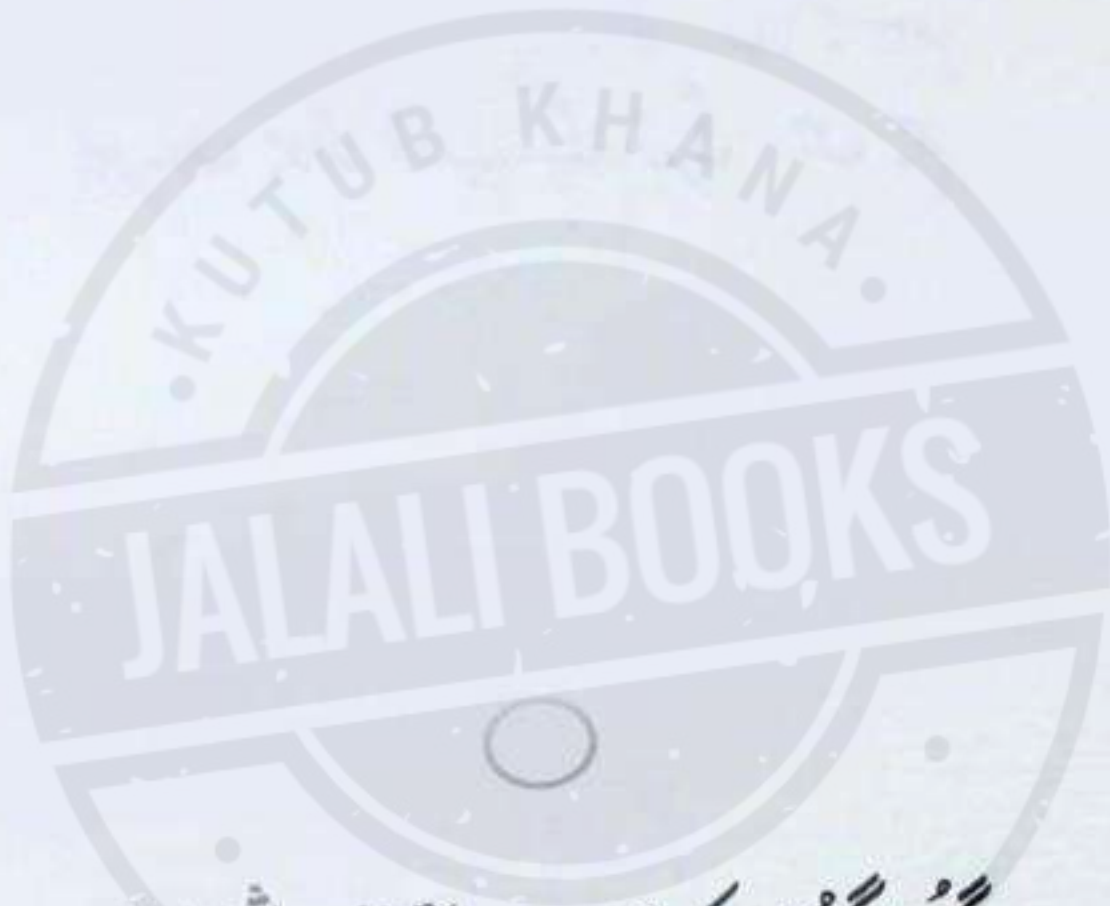
گھٹ گھٹ کے جی رہے تھے تری روشنی میں ہم
پھر آگئے ہیں ذات کی اندھی گلی میں ہم

رگ رگ میں آگ بھر گئی ساون کی دوستی
بارش ہوئی تو بھیگ گئے تھے خوشی میں ہم

وہ آدمی تو تھا ہی نہیں اس جہان کا
جس آدمی پہ مرتے رہے شاعری میں ہم

پلکوں پہ اپنی جلتے دیوں کا ہجوم ہے
کب سے نہار رہے ہیں اسی روشنی میں ہم

صرف ایک اپنی ذات سے ہیں سب عداوتیں
حد سے گزر نہ جائیں کہیں دشمنی میں ہم

یکلخت جگمگا اٹھا پہلے تو سارا جسم
پھر یوں ہوا کہ ڈوب گئے تیرگی میں ہم

○
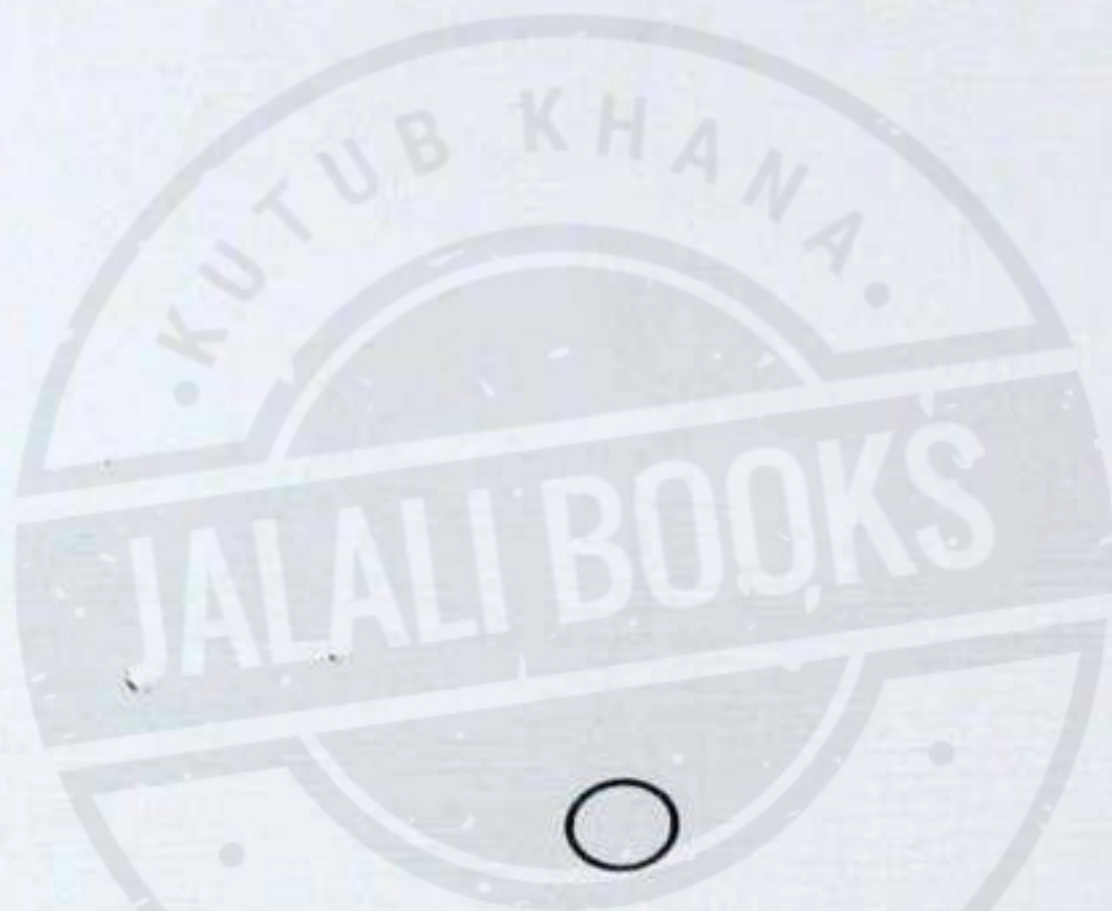
وہ ربط جو پہلے تھا کہاں ہے
اب کوئی [illegible] پکارتا کہاں ہے

کمرے کی گھٹن کا کیوں گلہ ہو
جنگل میں بھی اب ہوا کہاں ہے

آنکھوں پہ ہی گرد جم گئی تھی
منظر کوئی بدنما کہاں ہے

میں کس سے کہوں کہانی اپنی
اک شخص بھی جاگتا کہاں ہے

دنیا کی بہت طلب تھی تجھ کو
درویش! مجھے بتا کہاں ہے
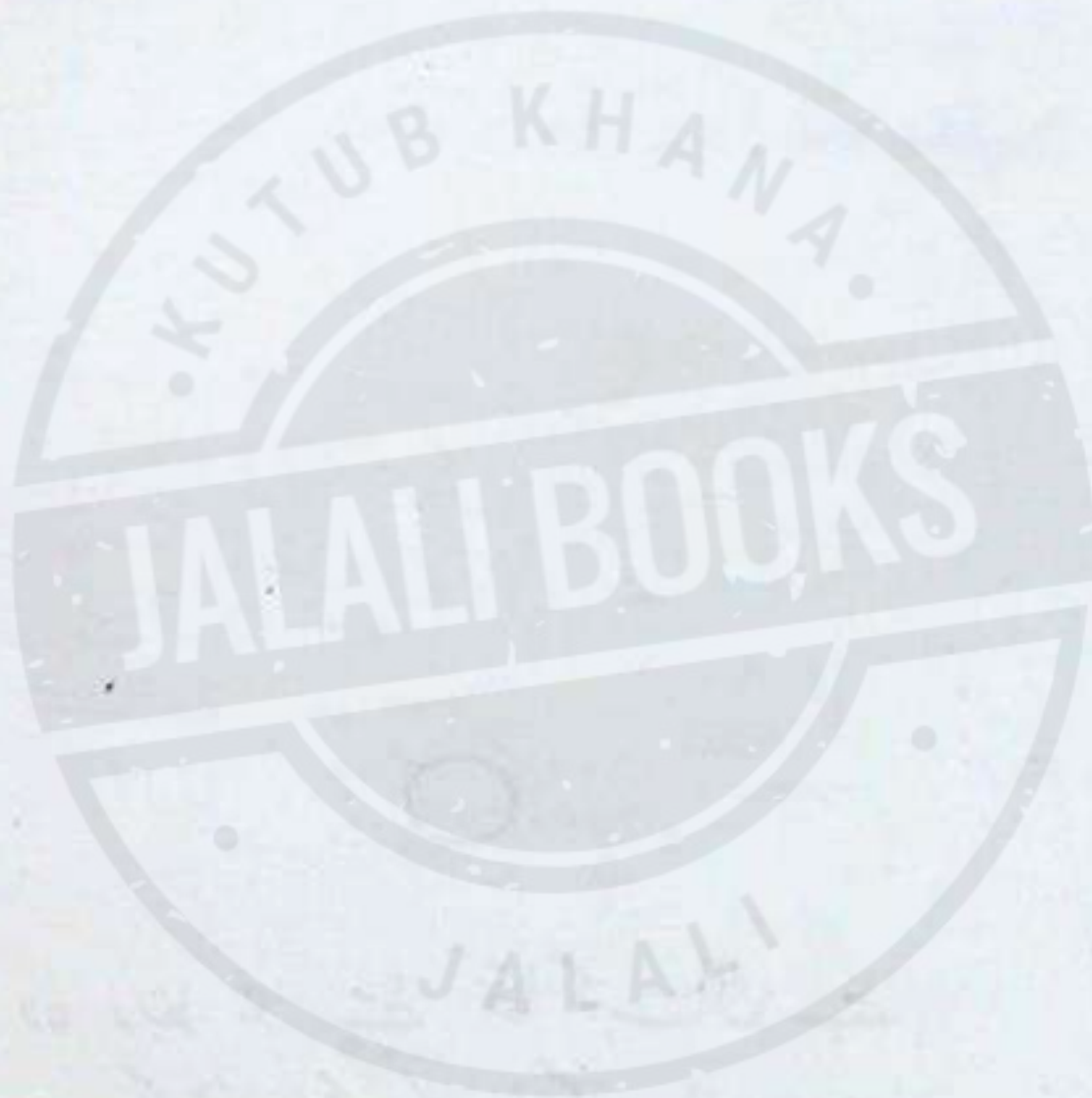
مدعا اب یاد آیا ہے کہ جب
خط میں گنجائش نہیں تحریر کی